حکومت بہار
اردو ڈائرکٹوریٹ
بہار، پٹنہ

فرد نامہ-۵

رضا نقوی واہی

ڈاکٹر ہمایوں اشرف

Monograph-5

Raza Naqwi Waahi

By Dr. Humayun Ashraf

رضا نقوی واہی (۱۹۱۴ء-۲۰۰۲ء) سرزمین عظیم آباد سے ادبی اُفق پر روشن و منور ہونے والے اردو کے عظیم طنزیہ ومزاحیہ شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنی ظریفانہ شاعری سے اردو ادب میں بیش بہا اضافہ کیا۔ اکبر الہٰ آبادی کے بعد جن شعراء نے اردو کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری کو اعتبار وافتخار بخشا، ان میں رضا نقوی واہی سرفہرست ہیں۔ بے پناہ تخلیقی صلاحیت، بے باکی، برجستگی، فنی نکات پر گرفت اور زبان پر ماہرانہ قدرت نے انھیں ان کے معاصرین میں ایک نمایاں مقام عطا کیا۔ اکبر کی طرح واہی نے بھی اپنے عہد کی ناہمواریوں کو اپنی ظرافت کا نشانہ بنایا، لیکن یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ واہی کے تجربات اکبر سے وسیع تھے۔ اکبر ماضی کی عظمت رفتہ کے مداح نظر آتے ہیں اور واہی کے یہاں جمہوری اقدار کی حصولیابی، عصری معاشرے کی عظمت کے لئے ضروری قرار پاتی ہے۔ واہی کی ظریفانہ شاعری ابتذال سے پاک ہے۔ اسی لئے یہ قدر اوّل کی چیز بن پائی۔

واہی کی ادبی خدمات چھ دہائیوں پر محیط ہیں۔ ان کے نو شعری مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہوئے۔ انھوں نے سماج کا گہرا مشاہدہ کیا تھا، اسی لئے ہر شعبے اور ہر طبقے پر خامہ فرسائی کی اور اسے اپنے قلم کا نشانہ بنایا، تاکہ ایک پاکیزہ، ذمہ دار اور صحت مند معاشرے کی تعمیر نو ہو سکے۔

اس فرد نامے (مونوگراف) کے مصنف ڈاکٹر ہمایوں اشرف ایک معتبر، ناقد، محقق اور صحافی ہیں۔ اب تک مختلف موضوعات پر ان کی تیس سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سعادت حسن منٹو کی کلیات (سات جلدیں) 'متن اور مفہوم'، 'فکشن کی بازیافت'، 'ادب نما'، 'اردو صحافت: مسائل اور امکانات'، 'سعادت حسن منٹو: ایک لیجینڈ'، 'منظر نامہ'، 'زکی انور: جائزے اور افسانے'، 'غیاث احمد گدی: فرد اور فنکار'، 'وہاب اشرفی: منفرد نقاد اور دانشور'، 'عبدالصمد: عکس در عکس'، 'الیاس احمد گدی' وغیرہ قابلِ ذکر تصانیف ہیں۔ ڈاکٹر ہمایوں اشرف ان دنوں ونوبا بھاوے یونیورسٹی، ہزاری باغ میں اردو کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ ادبی کارناموں کے اعتراف میں انھیں کئی انعامات واعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔

امتیاز احمد کریمی

प्रकाशक
उर्दू निदेशालय
मंत्रिमंडल सचिवालय विभाग, बिहार, पटना

معمارِدبستانِ بہار

فرد نامہ

رضا نقوی واہی

ڈاکٹر ہمایوں اشرف

طابع وناشر:
اردو ڈائرکٹوریٹ
محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار، پٹنہ

© جملہ حقوق بحق اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار محفوظ

سلسلہ نمبر۔ ۵

Raza Naqwi Waahi

By
Dr. Humayun Ashraf

نام کتاب	:	رضا نقوی واہی
مصنف	:	ڈاکٹر ہمایوں اشرف
سال اشاعت	:	2019ء
کل صفحات	:	144
کمپوزنگ	:	محمد ذاکر حسین رضوی
ترتیب وتزئین	:	محمد رضاء اللہ قاسمی
سرورق	:	امجد حسین ڈیزائن سنٹر، پٹنہ

ملنے کا پتہ :
اردو ڈائرکٹوریٹ، سی. بلاک، 111، آفیسرس فلیٹ، بیلی روڈ، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۱
فون نمبر : 0612-2530093، ای میل : directorurdu@gmail.com

مشمولات

پیش لفظ:	امتیاز احمد کریمی	۴
رضا نقوی واہی : ایک معروضی تعارف	اسلم جاوداں	۶
ابتدائیہ:	ڈاکٹر ہمایوں اشرف	۹

عنوانات

واہی: ایک نظر میں	۱۱
حیات اور شخصیت	۱۸
سنجیدہ شاعری	۳۹
ظریفانہ شاعری کا آغاز	۴۷
واہی کی تصانیف پر ناقدانہ نظر	۵۴
واہی کی ظریفانہ شاعری: فکری وفنی جہات	۹۷
واہی کا اسلوب نگارش	۱۲۷
کتابیات	۱۴۳

پیش لفظ

بہار کی سرزمین ہمیشہ سے بڑی مردم خیز رہی ہے۔ یہاں ہر شعبہ حیات میں نابغۂ روزگار اور یکتائے زمانہ شخصیتیں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ شعر و ادب کا شعبہ بھی اس وصف سے خالی نہیں ہے۔ یہاں ایسے ایسے ادبی لعل و گہر پیدا ہوئے، جنھوں نے صرف ریاست ہی نہیں بلکہ پوری دنیائے ادب میں بہار کا نام سربلند کیا اور تاریخ ادب اردو میں اپنی ادبی و شعری عظمت کا لوہا منوالیا۔

شاد عظیم آبادی، امداد امام اثر، فضل حق آزاد، شوق نیموی، انجم مانپوری، یاس یگانہ چنگیزی، بیدل عظیم آبادی، قاضی عبدالودود، جمیل مظہری، عطا کاکوی، اجتبیٰ رضوی، کلیم الدین احمد، اختر اورینوی، پرویز شاہدی، سہیل عظیم آبادی، کلیم احمد عاجز، رضا نقوی واہی، واقف عظیم آبادی، رمز عظیم آبادی، شکیلہ اختر، شین مظفر پوری، غیاث احمد گدّی، مظہر امام، کلام حیدری، شکیل الرحمٰن، الیاس احمد گدی، شفیع جاوید، عبدالمغنی، وہاب اشرفی، لطف الرحمٰن وغیرہ ایسی مستند، معتبر اور بلند قامت ادبی شخصیتیں ہیں جن پر اردو شعر و ادب بجا طور ناز کرسکتا ہے۔ یہ تمام اکابرین ادب، دبستان بہار کے معمار ہیں۔

اردو ڈائرکٹوریٹ حکومت بہار، دبستان بہار کی ایسی مقتدر اور سرکردہ ادبی شخصیتوں کی خدمات شعر و ادب کا صمیم قلب سے معترف اور قدردان ہے، نیز ان کے ادبی و شعری سرمائے کو زندہ اور تابندہ رکھنے کے منصوبے پر کاربند ہے۔ دبستان بہار کے ان لعل و گہر کو نئی نسل تک پہنچانا، ان سے متعارف کرانا، ان کی عظمت اور خدمت سے انھیں روشناس کرانا۔ ان کے دلوں میں اکابرین زبان و ادب کی قدر و منزلت پیدا کرنا، ہمارا نصب العین ہے۔

اسی مقصد کے پیش نظر اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیر اہتمام دبستان بہار کے مشاہیر و اکابرین ادب کی شعری و ادبی خدمات کی تفہیم اور ان کے شخصی تعارف کے لئے شاد عظیم آبادی، کلیم الدین احمد، کلیم عاجز، سہیل عظیم آبادی، عبدالمغنی، رضا نقوی واہی، وہاب اشرفی، رمز عظیم آبادی، پرویز شاہدی اور شین مظفر پوری پر فردنامے شائع کئے جارہے ہیں۔

رضا نقوی واہیؔ (۱۹۱۴ء-۲۰۰۲ء) سرزمین عظیم آباد سے ادبی اُفق پر روشن و منور ہونے والے اردو کے عظیم طنزیہ و مزاحیہ شاعر ہیں۔ انھوں نے اپنی ظریفانہ شاعری سے اردو ادب میں بیش بہا اضافہ کیا۔ اکبرالہٰ آبادی کے بعد جن شعراء نے اردو کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کو اعتبار و افتخار بخشا، ان میں رضا نقوی واہیؔ سرفہرست ہیں۔ بے پناہ تخلیقی صلاحیت، بے باکی، برجستگی، فنی نکات پر گرفت اور زبان پر ماہرانہ قدرت نے انھیں ان کے معاصرین میں ایک نمایاں مقام عطا کیا۔ اکبرؔ کی طرح واہیؔ نے بھی اپنے عہد کی ناہمواریوں کو اپنی ظرافت کا نشانہ بنایا، لیکن یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ واہیؔ کے تجربات اکبرؔ سے وسیع تھے۔ اکبرؔ ماضی کی عظمت رفتہ کے مداح نظر آتے ہیں اور واہیؔ کے یہاں جمہوری اقدار کی حصولیابی، عصری معاشرے کی عظمت کے لئے ضروری قرار پاتی ہے۔ واہیؔ کی ظریفانہ شاعری ابتذال سے پاک ہے۔ اسی لئے یہ قدر اوّل کی چیز بن پائی۔

واہیؔ کی ادبی خدمات چھ دہائیوں پر محیط ہیں۔ ان کے نو شعری مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہوئے۔ انھوں نے سماج کا گہرا مشاہدہ کیا تھا، اسی لئے ہر شعبے اور ہر طبقے پر خامہ فرسائی کی اور اسے اپنے قلم کا نشانہ بنایا، تاکہ ایک پاکیزہ، ذمہ دار اور صحت مند معاشرے کی تعمیر نو ہو سکے۔

اس فرد نامے (مونوگراف) کے مصنف ڈاکٹر ہمایوں اشرف ایک معتبر، ناقد، محقق اور صحافی ہیں۔ اب تک مختلف موضوعات پر ان کی تیس سے زائد کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں سعادت حسن منٹو کی کلیات (سات جلدیں) 'متن اور مفہوم'، 'فکشن کی بازیافت'، 'ادب نما'، 'اردو صحافت: مسائل اور امکانات'، 'سعادت حسن منٹو: ایک لیجینڈ'، 'منظر نامہ'، 'زکی انور: جائزے اور افسانے'، 'غیاث احمد گدی: فرد اور فنکار'، 'وہاب اشرفی: منفرد نقاد اور دانشور'، 'عبدالصمد: عکس در عکس'، 'الیاس احمد گدی' وغیرہ قابلِ ذکر تصانیف ہیں۔ ڈاکٹر ہمایوں اشرف ان دنوں ونوبا بھاوے یونیورسٹی، ہزاری باغ میں اردو کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ہیں۔ ادبی کارناموں کے اعتراف میں انھیں کئی انعامات و اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔

امتیاز احمد کریمی
ڈائرکٹر، اردو ڈائرکٹوریٹ
محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، پٹنہ

رضا نقوی واہیؔ: ایک معروضی تعارف

مختصر تعارف

سید محمد رضا نقوی واہیؔ کا شمار عصر حاضر کے بہترین طنز و مزاح نگاروں میں ہوتا ہے۔ اُنہوں نے اپنی بے مثال طنز و ظرافت اور اپنے منفرد طرز سخن کے ذریعہ بڑی شہرت و مقبولیت حاصل کی اور مزاحیہ شاعری کے باب میں پوری دنیا میں دبستانِ بہار کا لوہا منوالیا۔ واہیؔ کے کلام میں وسعت مشاہدہ، ژرف نگاہی، تہذیبی و عصری شعور اور اصلاحی تڑپ کی کارفرمائی بڑے فن اور سلیقے سے جلوہ ریز ہوتی ہے۔ وہ معاشرتی، اخلاقی اور سیاسی کج رویوں سے ہونے والے درد و کرب کو تبسم کے پردے میں اِس کمالِ فن کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ ان کی فنکارانہ صلاحیت کا لوہا ماننا ہی پڑتا ہے۔ اُن کے اِسی منفرد اور اعلیٰ شعری وصف کے پیشِ نظر بعض اہلِ نظر اُنہیں اکبرالہٰ آبادی کے بعد طنز و مزاح کا دوسرا بڑا شاعر تسلیم کرتے ہیں۔ ہندستان میں جنگِ آزادی کے دوران واہیؔ کے قلم نے مجاہدین کے حوصلوں میں نیا جوش بھرنے کا کام کیا۔ اُن کی نظم 'مانجھی' کی جوش انگیزی سے خائف ہو کر انگریزوں نے اِس پر پابندی لگا دی تھی۔ بلا شبہ رضا نقوی واہیؔ طنز و مزاح کے ایک اعلیٰ مرتبت اور مُقتدِر شاعر ہیں۔ طنز و مزاح نگاری کی تاریخ رضا نقوی واہیؔ کی شمولیت کے بغیر ادھوری اور نامعتبر سمجھی جائے گی۔ ریاست بہار کو ایسے رفیع القدر اور عالی مقام شاعر پر ناز ہے۔

رضا نقوی واہیؔ کا اصلی نام سید رضا نقوی تھا اور تخلص واہیؔ۔ وہ ۱۹/جنوری ۱۹۱۴ء کو سیوان کے موضع کھجوا میں پیدا ہوئے۔ اُن کے والد مولوی سید ظہور حسین زمیندار تھے۔ کچھ عرصے پولس اِنسپکٹر بھی رہے۔ اُن کی والدہ کا نام خیر النساء تھا۔ رضا نقوی واہیؔ کی اِبتدائی تعلیم و تدریس اُن کے گھر پر ہی ہوئی۔ پھر گاؤں کے ایک اسکول سے انہوں نے ساتویں کلاس تک تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۳۰ء میں پٹنہ کالجیٹ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۳۲ء میں پٹنہ کالج سے اِنٹرمیڈیٹ پاس کرنے کے بعد ۱۹۳۳ء میں صوفی کمرشیل اِنسٹی ٹیوٹ سے کامرس میں ڈِپلوما حاصل کیا۔ ۱۹۳۷ء میں بہار قانون ساز اسمبلی میں رِپورٹر (گزیٹیڈ) کے عہدے پر بحال ہوئے اور ترقی پاکر بہار قانون ساز کونسل کے سکریٹریٹ میں اسسٹنٹ سکریٹری کے عہدے پر فائز ہوئے اور جون ۱۹۷۲ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ ۱۹۳۸ء میں سیدہ شاکرہ خاتون سے شادی ہوئی تھی، جن سے آپ کو پانچ بیٹے سید علی رضا نقوی، سید احسن رضا نقوی، سید عابد رضا نقوی، سید جعفر رضا نقوی

،سید موسیٰ رضا نقوی اور تین بیٹیاں رضیہ فاطمہ، مرضیہ فاطمہ اور ذکیہ فاطمہ ہوئیں۔

واہی ایک بڑے شاعر ہی نہیں؛ بلکہ بڑے خلیق، منکسر المزاج، ملنسار اور ہردلعزیز انسان تھے۔ اُن کی مہمان نوازی مشہور ہے۔ ایک بار جو شخص اُن سے مل لیتا اُن کا گرویدہ ہو جاتا۔ رضا نقوی واہی نے ۱۹۲۸ء سے شاعری شروع کی۔ غزل، نوحے، سلام اور قصیدے لکھے۔ سنجیدہ اور ظریفانہ دونوں طرح کی نظمیں کہیں؛ لیکن آہستہ آہستہ وہ طنز و مزاح کی طرف مائل ہو گئے۔ اُن کے کلام کے دس مجموعے شائع ہوئے۔

رضا نقوی واہی طنز و مزاح کے ایک بلند پایہ شاعر ہونے کے ساتھ ایک صاحب طرز نثر نگار بھی تھے۔ اُنہوں نے درجنوں تنقیدی مضامین لکھے جو مُلک کے معتبر رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ پٹنہ سے شائع ہونے والے مشہور روزنامہ 'ساتھی' میں وہ کئی برسوں تک مزاحیہ کالم لکھتے رہے۔ واہی کے شاگردوں کا حلقہ کافی وسیع رہا ہے، جن میں اسرار جامعی، جوہر سیوانی، نٹ کھٹ عظیم آبادی، شہزاد معصومی، قمر الزماں قمر، صابر بہاری، ابرار ساغر اور منیر سیفی وغیرہ اہم ہیں۔

تصنیفات

(۱) واہیات (۱۹۵۰ء)	(۲) طنز و تبسم (۱۹۶۳ء)
(۳) نشتر و مرہم (۱۹۶۸ء)	(۴) کلامِ نرم و نازک (۱۹۷۲ء)
(۵) نام بنام (۱۹۷۳ء)	(۶) متاعِ واہی (۱۹۷۷ء)
(۷) شعرستانِ واہی (۱۹۸۳ء)	(۸) منظوماتِ واہی (۱۹۹۲ء)
(۹) ترکشِ واہی (۱۹۹۵ء) ہندی رسم الخط میں	(۱۰) چٹ پٹی نظمیں (۱۹۷۱ء) دیوناگری رسم الخط میں

ایوارڈ و اعزاز

- جناب گیانی ذیل سنگھ سابق صدر جمہوریہ کے ہاتھوں غالب انسٹی چیوٹ دہلی نے ۱۹۸۵ء میں ''غالب ایوارڈ'' سے سرفراز کیا۔
- محکمہ راج بھاشا حکومت بہار نے ۱۹۹۹ء میں ''مولانا مظہر الحق شیکھر سمان'' جیسے باوقار ایوارڈ سے نوازا۔
- بہار اردو اکادمی نے ادبی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۷۷ء میں خصوصی انعام سے نوازا۔
- اس کے علاوہ یوپی اردو اکادمی، لکھنؤ کل ہند میر اکادمی لکھنو، مغربی بنگال اردو اکادمی (کولکاتہ) اور پٹنہ یونیورسٹی کے ذریعہ بھی مختلف انعامات و اعزازات سے نوازے گئے۔

اِنتخاب اشعار

- پڑھ کر کے ڈاکٹر نہ پلیڈر بنے گا وہ — ہو کر جوان، قوم کا لیڈر بنے گا وہ

(نورِ چشم)

- ہر ایک دل میں ہے آگ آپ کی لگائی ہوئی — غرض زباں نہ ہوئی اک دیا سلائی ہوئی

(میر فتنہ)

- بیٹے کو چک سمجھ لیا اسٹیٹ بینک کا — سمدھی تلاش کرنے لگے ہائی رینک کا

(معرکۂ جہیز و دین مہر)

- دم نکلتے ہی چڑھا سب پر عقیدت کا بخار — قدرداں حضرات کو شاید یہی تھا انتظار
- کر دیا اس موت نے ثابت یہ ہم پر کم سے کم — زندگی سے موت بہتر ہے بچے اہل قلم
- اہل فن کو موت سے ہرگز نہ ڈرنا چاہیے — بلکہ ممکن ہو تو کوشش کرکے مرنا چاہیے

(انتقال کے بعد)

- بھگوان مرے دل کو وہ زندہ تمنّا دے — جو حرص کو بھڑکا دے اور جیب کو گرما دے
- مفلس کی لنگوٹی تک باتوں میں اتروا لوں — احسان کے پردے میں چوری کا سلیقہ دے
- تھوڑی سی جو غیرت ہے وہ بھی نہ رہے باقی — احساس حمیّت کو اس دل سے نکلوا دے
- القصّہ مرے مالک تجھ سے یہ گزارش ہے — مرغی وہ عنایت ہو، سونے کا جو انڈا دے

(نئے لیڈر کی دعا)

- رِشوت کو بُرا کہتے ہے ارباب حماقت — کلجگ میں نہیں اس سے بڑی کوئی صداقت
- ہے آج یہی طرۂ دستار زمانہ — ہے آج یہی زینت کرسئ سیاست
- رشوت سے ٹھہر جاتی ہے دریا کی روانی — رشوت سے بدل جاتی ہے شعلۂ کی طبیعت

(رشوت)

- معلوم نہیں آپ کو یہ نکتۂ تاریخ — جو قوم کی خصلت ہے وہی ریل کی خصلت
- وہ ریل کی رفتار ہو یا وقت کی رفتار — اس ملک میں دونوں کو تساہل کی ہے عادت
- پابندئ اوقات میں ہے رنگِ غلامی — آزاد ہوا ہند تو کیا اس کی ضرورت

(ریل کا سفر)

اسلم جاوداں
نائب مدیر سہ ماہی 'بھاشا سنگم'
اردو ڈائرکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، پٹنہ

ابتدائیہ

رضا نقوی واہی بہار کے ایک ایسے زندہ دل انسان اور قادر الکلام شاعر تھے، جنہوں نے ادبی افق پر نمودار ہو کر اردو کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کو اپنے علم و فن کی روشنی سے جگمگا دیا اور اپنی فکر و آگہی سے اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ اکبر الہ آبادی کے بعد جن شعرا نے اردو کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کو اعتبار و افتخار بخشا، ان میں رضا نقوی واہی کا نام سرفہرست ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض ناقدین کی نگاہ میں موصوف، اکبر الہ آبادی کے بعد دوسرے بڑے طنز و مزاح نگار ہیں۔ انہوں نے ظریفانہ شاعری میں مختلف کارہائے نمایاں انجام دے کر ادب نواز حلقوں کو نہ صرف متاثر کیا؛ بلکہ ان کے دلوں میں اپنے لیے ایک مستقل اور مستحکم جگہ بھی بنالی۔

واہی کی ادبی خدمات چھ دہائیوں پر محیط ہیں۔ وہ تادم حیات مختلف شعبہ ہائے زندگی کی کج رویوں، بے راہ رویوں اور برائیوں پر اپنے طنز سے نشتر زنی کر کے انہیں دور کرنے کی سعی پیہم کرتے رہے؛ تاکہ ایک پاکیزہ، ذمہ دار اور صحت مند معاشرے کی تعمیر نو ہو سکے اور مزاح کے پھول کھلا کر اہل دنیا کے اداس، مضمحل اور افسردہ چہروں کو ایک حقیقی خوشی اور ان کے لبوں کو ایک دائمی مسکراہٹ عطا کی جا سکے۔ واہی نے انسان کی کج ادائیوں اور معاشرے کی بے اعتدالیوں پر ناقدانہ نگاہ ڈالی اور ان پر جی کھول کر قہقہہ لگایا، خود ہنسے اور قارئین کو بھی ہنسایا۔ ہنسنے اور ہنسانے کے اس عمل میں ہم اور ہمارا سماج بے نقاب ہوتا رہا۔ اپنے ہی زخموں کو کرید کر قہقہہ لگانا بڑے دل گردے کی بات ہے، واہی میں یہ جرأت موجود ہے۔ دراصل انہوں نے طنز و مزاح کو مقصدیت کا جامہ پہنا کر وہی کام کیا جو ایک مصلح اپنی قوم کے لیے کرتا ہے۔

رضا نقوی واہی نے زندگی کے حقائق کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ ان کے یہاں موضوعات کی ایک وسیع دنیا آباد ہے۔ انہوں نے سیاسی اور مذہبی ناہمواری کے علاوہ سماجی، اخلاقی، تعلیمی، معاشی، قومی، احتجاجی اور ادبی مسائل کی تہ تک پہنچنے کی سعی کی اور ان کی بوالعجبیوں کو طنز و تمسخر کا نشانہ بنایا۔ واہی سماج کے ہر

شعبے کا پہلے باریک بینی سے مشاہدہ کرتے اور پھر اسے ہدف طنز بناتے ہیں۔ پروفیسر عبدالمغنی کا خیال ہے کہ اکبر نے اپنی شاعری کے ذریعہ اپنے عہد میں مغربی تہذیب کی یلغار سے رونما ہوئے خطرات پر قابو پانے کی کوشش کی ہے، اسی کے مانند واہی نے بھی نام نہاد قومی دھارے کے گردابوں سے باخبر کرنے کی سعی کی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جہاں اکبر کی شاعری اپنے دور کی تعلیم اور تہذیب کی محافظ بنی، وہیں واہی کی ظرافت نگاری ہمارے معاشرہ کی تنقید حیات بنتی رہی۔ واہی کی بے پناہ تخلیقی صلاحیت، بے باکی، برجستگی، فنی وسائل پر گرفت اور زبان پر ماہرانہ قدرت نے انہیں ان کے معاصروں میں ایک الگ ہی مقام دلایا۔ انہوں نے آزادی کے بعد ہندوستان کی سیاسی، سماجی زندگی، شعبۂ تعلیم، شعر و ادب اور تحقیق و تنقید کو خاص طور پر اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ وہ جس انداز سے طنز کے تیر چلاتے ہیں، وہ انہی کا حصہ ہے؛ کیوں کہ جس پر نشانہ لگایا جاتا ہے وہ زخمی تو ہوتا ہے؛ مگر آہیں نہیں بھرتا، صرف سسکیاں لے کر رہ جاتا ہے۔ ان کا مزاح کھل کر ہنسنے اور قہقہہ بکھیرنے کے لیے نہیں، زیر لب مسکرانے کے لیے ہے۔ اس مزاح کے پس پردہ درد کی زیریں لہریں رواں ہیں، یہی واہی کے طنز و مزاح کا اختصاص ہے، جو انہیں دوسرے مزاح نگاروں سے ممیّز و ممتاز کرتی ہے۔

مقام مسرت ہے کہ یہ کتاب اردو ڈائریکٹوریٹ، محکمہ کابینہ سکریٹریٹ، حکومت بہار کے تحت منظر عام پر آ رہی ہے۔ میں اردو ڈائریکٹوریٹ کے صدر نشیں (ڈائرکٹر) جناب امتیاز احمد کریمی کا ممنون ہوں کہ انہوں نے رضا نقوی واہی جیسے قادر الکلام شاعر اور معمار ادب پر کام کرنے کی دعوت دی اور مجھے اپنی افتاد طبع کے مطابق کام کی سہولت بھی فراہم کی۔ میں ان کا صمیم قلب سے مشکور ہوں۔ اسی طرح ڈائریکٹوریٹ کے پروگرام آفیسر ڈاکٹر اسلم جاوداں کا بھی شکریہ کہ انہوں نے اس کام میں ہمیشہ ذاتی دلچسپی کا اظہار کیا اور اس کی تکمیل کے بعد اشاعت میں عجلت برت کر میری طرف سے ہونے والی تاخیر کا ازالہ کرنے کی کوشش کی۔

یہ فرد نامہ (مونوگراف) آٹھ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کی تصنیف میں اس بات کا خیال رکھا گیا ہے کہ رضا نقوی واہی کے حالات زندگی، سیرت و شخصیت، تعلیم و تربیت، ملازمت، تصنیفات و تالیفات اور شاعری کی تمام جہتیں پوری طرح اجاگر ہو جائیں اور پڑھنے والا ان کے بارے میں کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ تفصیلات سے آگاہ ہو جائے۔ میں اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں، اس کا فیصلہ تو قارئین ہی کریں گے۔

(ڈاکٹر) **ہمایوں اشرف**
شعبہ اردو
ونوبا بھاوے یونیورسٹی، ہزاری باغ

واہیؔ: ایک نظر میں

نام : سید محمد رضا نقوی

تخلص : رضا نقوی (جب ظریفانہ کلام لکھنے کا سلسلہ شروع ہوا تو تخلص واہیؔ ہوگیا)

ولادت : ۱۹؍جنوری ۱۹۱۴ء

والد : مولوی سید ظہور حسین
(چھوٹے موٹے زمیندار، کچھ عرصے تک پولس انسپکٹر رہے)

وفات : جنوری ۱۹۶۲ء

والدہ : خیر النساء

وطن : موضع کھجوا، ضلع: سیوان، بہار

تعلیم : ابتدائی تعلیم روایتی طرز پر گھر ہی میں ہوئی۔
مولوی عین الہدیٰ ثمر (پٹنہ سٹی کے باشندے تھے) سے عربی اور فارسی سیکھی۔
بستی کے اسکول میں مڈل تک تعلیم حاصل کی۔
پٹنہ کالجیٹ ہائی اسکول سے میٹرک (۱۹۳۰ء) اور پٹنہ کالج، پٹنہ سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان (۱۹۳۲ء) پاس کرنے کے بعد صوفی کمرشیل انسٹی ٹیوٹ، کلکتہ سے ڈپلوما اِن کامرس (۱۹۳۳ء) حاصل کیا۔

صحبت : پٹنہ کالج میں اختر اورینوی، زبیر احمد تمنائی، علی عباس (چچازاد بھائی جو ڈی آئی جی کے عہدے سے ریٹائرڈ ہوئے)، یحییٰ نقوی، شرف الدین احمد شرفؔ عظیم آبادی، سلطان احمد بہزاد فاطمی وغیرہ کی صحبت رہی۔

شادی : ۱۹۳۸ء

اہلیہ : سیدہ شاکرہ خاتون

وطن : قصبہ بگھونی، ضلع سیوان، بہار

اولاد : پانچ بیٹے اور تین بیٹیاں

بیٹے : سید رضا علی نقوی، سید احسن رضا نقوی، سید عابد رضا نقوی، سید جعفر رضا نقوی، سید موسیٰ رضا نقوی مرحوم (مختصر سی علالت میں ۶؍مارچ ۱۹۹۹ء کو وفات پائے)

بیٹیاں : رضیہ فاطمہ زوجہ سید محمد رضی نقوی، بینک منیجر کے عہدے سے سبکدوش ہوئے
مرضیہ فاطمہ زوجہ سید نادر علی، محکمۂ ریل میں پارسل کلرک
ذکیہ فاطمہ زوجہ سید سرور عباس رضوی، آڈیٹر محکمہ امداد باہمی

ملازمت : ۱۹۳۷ء میں بہار لجس لیٹیو اسمبلی میں بحیثیت اردو رپورٹر ترقی پاکر بہار لجس لیٹو کونسل کے سکریٹریٹ سے اسسٹنٹ سکریٹری کے عہدے سے جون ۱۹۷۲ء میں سبکدوش ہوئے۔

تخلیقی سفر : پہلے شعر کی تخلیق ۱۹۲۸ء
پہلی غزل کی تخلیق ۱۹۳۲ء
پہلی غزل کی اشاعت ۱۹۳۹ء
پہلی نظم کی تخلیق ۱۹۳۵ء
پہلی مطبوعہ نظم ''آج کچھ کھایا نہیں'' ۱۹۳۶ء، مشمولہ ''ادبِ لطیف''، لاہور
پہلی ظریفانہ نظم ''ایم ایل اے'' کی اشاعت ۱۹۵۰ء
پہلی تنقیدی تحریر ''بہار میں اردو شاعری'' کی اشاعت ۱۹۵۷ء

☆ ادبی اور شعری ذوق کی نشو ونما کھجوا بستی کے ادبی ماحول میں ہوئی۔ موزوں، ناموزوں مصرعے مڈل اسکول کے زمانے میں ہی لکھنے لگے تھے۔ پٹنہ کالج میں طالب علمی کے دوران ان کی شاعری کو پھلنے پھولنے کا زیادہ موقع ملا۔ شروع میں سنجیدہ شاعری کی۔ ۱۹۵۰ء میں طنز و مزاح کی طرف مائل ہوئے اور پھر اسی کے ہو کر رہ گئے۔

☆ ابتدا میں جوش ملیح آبادی سے بہت متاثر رہے، جوش کے انداز فکر و بیان کو ان کے ذہن نے قبول کیا اور انہوں نے بہت سی سنجیدہ نظمیں، مثلاً ''مانجھی''، ''بھوک''، ''مشعل''، ''آج کچھ کھایا نہیں''، ''اچھوت'' وغیرہ ان کے طرز پر لکھیں، جو اس زمانے کے رسائل ''نگار''، ''ساقی''، ''ادب لطیف'' اور ''ایشیاء'' وغیرہ میں شائع ہوئیں، واہیؔ، جوش کے علاوہ میر انیس کے کلام سے بھی متاثر ہوئے۔

شرف تلمذ : ابتدا میں عین الہدیٰ ثمرؔ سے اصلاح لیتے تھے۔ انہوں نے ہی شاعری کے ابتدائی رموز سے آگاہ کیا۔

شعری مجموعے (اردو) : (۱) ''واہیات'' ۱۹۵۰ء (عبدالقیوم انصاری کے مالی تعاون سے شائع ہوا۔)

(۲) ''طنز و تبسم'' ۱۹۶۳ء، مکتبہ ادب، گردنی باغ، پٹنہ سے شائع ہوا۔

(۳) ''نشتر و مرہم'' ۱۹۶۸ء، زندہ دلانِ حیدرآباد سے شائع ہوا۔

(۴) ''کلام نرم و نازک'' ۱۹۷۲ء، مرتبہ: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ کے زیر اہتمام شائع ہوا۔

(۵) ''نام بنام'' (منظوم خطوط کا مجموعہ) ۱۹۷۴ء میں پی کے پبلی کیشنز، پرتاپ اسٹریٹ، دریا گنج، دہلی سے شائع ہوا۔

(۶) ''متاع واہیؔ'' ۱۹۷۷ء، بہار اردو اکیڈمی کی جزوی مالی امداد سے شائع ہوا۔

(۷) ''شعرستان واہیؔ'' ۱۹۸۳ء میں بہار اردو اکیڈمی کے جزوی مالی تعاون سے اشاعت پذیر ہوا۔

(۸) ''منظومات واہیؔ'' ۱۹۹۲ء جے ٹی ایس پرنٹرز، لنگر ٹولی پٹنہ نے شائع کیا۔

(۹) ''باقیات واہیؔ'' ۲۰۰۴ء، مرتبین: ڈاکٹر شہناز فاطمی و سید جعفر رضا نقوی، گنگا جمنا پرکاشن، پٹنہ کے توسط سے طبع ہوا۔

بہ زبان ہندی : ''چٹ پٹی نظمیں'' ۱۹۷۱-۷۲ء، مکتبہ تحریک، دہلی نے دیوناگری رسم الخط میں شائع کیا۔

''ترکش واہیؔ'' ۱۹۹۵ء میں منظر عام پر آیا۔

نثری کارنامے : واہیؔ ایک صاحب طرز نثر نگار بھی ہیں۔ وہ برسوں روزنامہ ''ساتھی'' پٹنہ میں مزاحیہ کالم لکھتے رہے۔ وقتاً فوقتاً انہوں نے متعدد تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں، جو مختلف رسائل میں چھپ چکے ہیں۔ ان کی ایک نثری کتاب ''اردو شاعری اور بہار'' بہار ہندی ساہتیہ سمیلن کے زیر اہتمام ہندی رسم الخط میں ۱۹۷۱ء میں شائع ہوئی۔

ترتیب و تدوین : (۱) ۱۹۴۴ء میں زبیر احمد تمنائی (اب پاکستان میں ہیں) کے اشتراک سے بہار کے نظم گو شعرا پر مشتمل ایک انتھولوجی بنام ''اشارہ'' ترتیب دے کر چھاپی۔

(۲) ۱۹۵۱ء-۵۲ء میں ''اشارہ'' کی دوسری جلد مرتب کر کے شائع کروائی۔

(۳) ۱۹۵۳ء میں علامہ جمیل مظہری مرحوم کی نظموں کا مجموعہ ''نقش جمیل'' ترتیب دے کر شائع کرایا۔

(۴) ۱۹۵۶-۱۹۵۷ء میں جمیل مظہری کی غزلوں کا مجموعہ ''فکر جمیل'' ترتیب دے کر طبع کرایا۔

(۵) ۱۹۶۵ء میں کچھ نوجوان دوستوں کے اشتراک سے پروفیسر اختر اورینوی کی شخصیت اور فن پر تقریباً چھ سو صفحات پر مشتمل ایک رسالے کا خاص نمبر نکالا۔

دیگر مطبوعہ تحریریں : تقریباً ۲۰ر مقالات
تقریباً دو درجن کتابوں پر تبصرے اور تجزیے۔
متعدد کتابوں کے مقدمے، دیباچے اور آرا۔

دیگر خدمات : صدہا مشاعروں میں شرکت کر کے محفلوں کو زعفران زار بنایا۔
ریڈیو تبصرے اور فیچر نیز ٹی وی پروگرام۔
۱۹۷۶ء میں ظریفانہ ادب کے فروغ اور اسے خاص و عام میں مقبول بنانے کے لیے چند ہم خیال حضرات کے تعاون سے ''کل ہند جشن ظرافت کمیٹی'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔
ہندوستان اور پاکستان کے کئی اہم مزاح نگاروں کو مدعو کر کے ''جشن ظرافت'' کا اہتمام کیا۔ ۱۱، اور ۱۲ دسمبر ۱۹۷۶ء کو پٹنہ میں منعقدہ عظیم الشان ''جشن ظرافت'' تاریخی نوعیت کی محفل تھی، جس کے انعقاد کا سہرا یقیناً واہیؔ کے سر جاتا ہے۔

شاگرد (شاعری) : جوہر سیوانی، نٹ کھٹ عظیم آبادی، اسرار جامعی، شہزاد معصومی، قمر الزماں قمر، صابر بہاری، ابرار ساغر، منیر سیفی وغیرہ۔

ایوارڈز : (۱) بہار اردو اکیڈمی، پٹنہ نے ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ۱۹۷۷ء میں تین ہزار روپے کا خصوصی انعام دیا۔
(۲) غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی نے طنز و مزاح کی خدمات کے لیے ۱۹۸۵ء اور ۱۹۸۷ء میں غالب ایوارڈ سے نوازا۔
(۳) محکمہ راج بھاشا، حکومت بہار نے ان کی گراں مایہ شعری خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے جون ۱۹۹۹ء میں پروقار ''مولانا مظہر الحق شیکھر سمان'' سے نوازا۔
(۴) ادارہ ''اعتراف'' پٹنہ نے ان کے ادبی کارناموں کے اعتراف میں ''جشن واہیؔ'' کا انعقاد کر کے انہیں ''اعتراف ایوارڈ ۱۹۹۹ء'' سے سرفراز کیا۔

کتابوں پر انعامات و اعزازات : (۱) ''طنز و تبسم'' پر پٹنہ یونیورسٹی سے ڈھائی سو روپے کا انعام ملا۔
(۲) ''اردو شاعری اور بہار'' پر بہار راشٹر بھاشا پریشد نے پانچ سو روپے کا انعام دیا۔
(۳) ''کلام نرم و نازک'' پر ۱۹۷۲ء میں یوپی اردو اکیڈمی، لکھنؤ سے ایک ہزار روپے اور بہار اردو اکیڈمی سے پانچ سو روپے کے انعامات ملے۔
(۴) ''نام بنام'' پر ۱۹۷۳ء میں یوپی اردو اکیڈمی نے ایک ہزار روپے کا انعام دیا۔
(۵) ''متاع واہیؔ'' پر ۱۹۷۷ء میں کل ہند میر اکیڈمی، لکھنؤ نے پانچ سو روپے کا انعام اور سند سے نوازا۔ اسی پر یوپی اردو اکیڈمی نے بھی پندرہ سو روپے کا انعام دیا۔
(۶) ''شعرستان واہیؔ'' پر ۱۹۸۳ء میں بہار اردو اکیڈمی نے دو ہزار، اتر پردیش اردو اکیڈمی نے دو ہزار اور مغربی بنگال اردو اکیڈمی نے پانچ سو روپے کے انعامات سے نوازا۔

قدر شناسی : (۱) ۲۰۰۳ء میں رضا نقوی واہیؔ کی شخصیت اور شاعری پر راقم الحروف کی ایک ضخیم کتاب ''رضا نقوی واہیؔ: آئینہ در آئینہ'' کے نام سے شائع ہوئی۔ ان کی شخصیت اور فن پر یہ پہلی کتاب ہے۔
(۲) ۱۹۸۵ء میں رانچی یونیورسٹی نے اسی یونیورسٹی کے لکچرر محمد عقیل اشرف کو تحقیقی مقالے ''رضا نقوی واہیؔ کی مزاحیہ شاعری کا تنقیدی مطالعہ'' پر پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی۔ ان کے نگراں پروفیسر سمیع الحق تھے۔
(۳) ڈاکٹر ممتاز احمد خاں، ریڈر شعبہ اردو، بی آر امبیڈکر بہار یونیورسٹی، مظفر پور کی نگرانی میں جناب مشتاق احمد مشتاق، صدر شعبۂ اردو، ویمنس کالج، حاجی پور نے ''جدید اردو شاعری میں طنز و مزاح کی روایت اور رضا نقوی واہیؔ کی شاعری'' کے عنوان کے تحت تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی قلم بند کیا جس پر انہیں ڈگری تفویض ہوئی۔

(۴) شفیقہ فرحت کی نگرانی میں جاوید اختر نے تحقیقی کام کیا ہے۔

(۵) متعدد ریسرچ اسکالرز کئی یونیورسٹیوں میں پی ایچ ڈی اور ایم فل کر رہے ہیں۔

(۶) رسالہ ''ادب نکھار'' مئو ناتھ بھنجن نے ۱۹۸۳ء میں ان کی شخصیت اور کارنامے پر ایک ضخیم نمبر شائع کیا۔

(۷) ماہنامہ ''اردو دنیا'' دہلی نے مئی ۲۰۱۵ء کے شمارہ میں واہیؔ کی شخصیت اور فن پر ایک خصوصی گوشہ شائع کیا۔

(۸) ان کی کئی نظمیں یونیورسٹیوں کے نصاب میں شامل ہیں۔

(۹) برصغیر ہند و پاک کے متعدد ادیبوں نے ادبی خدمات کو سراہا ہے۔

بیرونی ملک کا سفر : تقسیم ہند کے بعد بہتر زندگی اور معاش کی تلاش میں واہیؔ صاحب پاکستان بھی گئے تھے۔ وہاں کی قومی اسمبلی میں انہیں باوقار ملازمت بھی مل گئی تھی؛ لیکن اس مملکت اسلامی میں ان کا دل نہیں لگا اور وہ وطن واپس لوٹ آئے۔

وفات : ۵؍جنوری ۲۰۰۲ء

بوقت : ڈیڑھ بجے دن

تدفین : شیعہ قبرستان، افضل پور، پٹنہ

*

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

*

حیات اور شخصیت

رضا نقوی واہیؔ کا پورا نام سید محمد رضا نقوی، تخلص واہیؔ تھا۔ ان کی ولادت صوبۂ بہار کی سارن کمشنری کے ضلع سیوان کی ایک مردم خیز بستی ''کھجوا'' میں ۱۹؍جنوری ۱۹۱۴ء کو ہوئی۔ واہیؔ کے صاحبزادے سید عابد رضا نقوی نے راقم الحروف کو بتایا کہ ان کی تاریخ پیدائش ۱۷؍جنوری ۱۹۱۴ء نہیں؛ بلکہ ۱۹ جنوری ۱۹۱۴ء ہے، جب کہ ان کے میٹرک کے سرٹیفیکٹ میں ان کی تاریخ پیدائش ۱۹؍فروری ۱۹۱۵ء درج ہے۔ اس تاریخی بستی کے چھوٹے موٹے زمیندار سید ظہور حسین اپنی اہلیہ خیر النساء کے ہمراہ ایران اور عراق کے سفر پر روانہ ہوئے اور سخت مشقت و پریشانی کو جھیلتے ہوئے زیارت کی غرض سے جناب رضا علیہ السلام کے روضۂ اقدس پر پہنچے۔ وہاں روضہ پر مانگی گئی دعاؤں کے طفیل وطن واپسی کے چند ماہ بعد ہی ان کے گھر میں اولاد نرینہ ہوئی، جسے ان لوگوں نے زیارت کا تحفہ تسلیم کرتے ہوئے اس کا نام ''محمد رضا'' رکھا۔ مولوی سید ظہور حسین اور محترمہ خیر النساء کی یہ اکلوتی اولاد ''رضا نقوی واہیؔ'' کے نام سے اردو طنز و ظرافت کے افق پر درخشاں ستارہ بن کر چمکا۔ تاجدار طنز و ظرافت رضا نقوی واہیؔ نے راقم الحروف کو دیئے گئے انٹرویو کے دوران اپنی بستی اور خاندان کے متعلق فرمایا تھا کہ:

> ''میری پیدائش موضوع کھجوا، ضلع سیوان (بہار) میں ۱۹۱۴ء میں ایک سادات گھرانے میں ہوئی، جو چھوٹی زمینداری اور کاشت کاری پر گزر اوقات کرتے تھے، بستی بہت بھری پری تھی، لوگ خوشحال تھے، سیر و تفریح اور شکار کے دلدادہ تھے، شعر و شاعری کا

غلغلہ تھا، خاص طور پر عزاداری کے سلسلے میں نوحے، سلام اور مراثی کا خاصا رواج تھا۔ مرثیہ خوانی کے لیے اچھے مرثیہ گو عظیم آباد سے بلوائے جاتے تھے۔ ایسے ہی ماحول میں آنکھ کھلی، تھوڑا ہوش آیا تو مہمان مرثیہ گو شعرا کی صحبت ملی جو سمند ناز پر تازیانہ ہوئی اور کٹر مٹر شعر بھی موزوں ہونے لگے۔ یوں کہیے کہ تک بندی سات آٹھ سال کی عمر کو ہی گلے پڑ گئی جو آگے چل کر ایک تناور درخت میں تبدیل ہوئی۔ خاندانی سلسلہ حضرت امام نقی علیہ السلام سے ملتا ہے۔ ہمارے اسلاف ایران سے کوچ کر کے سندھ، گجرات، جون پور (یو پی) ہوتے ہوئے موضع کھجوا میں ۱۷ویں صدی عیسوی میں وارد ہوئے اور سوڈیڑھ سو سال کے اندر یہ بستی صوبۂ بہار کی مثالی بستیوں میں گنی جانے لگی۔ آپ اس سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان دنوں وہاں لیتھو پریس کی دو مشینیں، لندن سے برآمد کی گئی تھیں جن پر دینی کتابیں شائع ہوتی تھیں اور پچاسوں ہنرمند افراد مشغول کار تھے''۔

(''رضا نقوی واہی: آئینہ در آئینہ'' مرتبہ: ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ص:۱۳۶)

واہی کی ابتدائی تعلیم روایتی طرز پر گھر میں ہوئی، اس کے بعد گاؤں کے ہی ایک اسکول میں مڈل تک تعلیم حاصل کی۔ اس کے بعد پٹنہ کالجیٹ ہائی اسکول میں داخلہ لے کر ۱۹۳۰ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ واہی اردو کے علاوہ عربی، فارسی اور انگریزی کی اچھی صلاحیت رکھتے تھے۔ انہوں نے ابتدا میں مولوی عین الہدیٰ ثمرؔ سے فارسی اور عربی سیکھی۔ بچپن سے ہی گھریلو تعلیم و تربیت اور ادب و تہذیب نے ان کے اندر ایک ایسی شمع روشن کر دی تھی، جس کی ضیا آگے چل کر بہت دور تک پھیلی۔

رضا نقوی واہی نے ۱۹۳۲ء میں پٹنہ کالج سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا، وہاں دوران تعلیم انہیں اختر اورینوی، زبیر احمد تمنائی، علی عباس، یحییٰ نقوی، شرف الدین احمد شرفؔ عظیم آبادی، سلطان احمد بہزاد فاطمی وغیرہ کی صحبت حاصل رہی۔ ابھی تعلیمی سلسلہ جاری ہی تھا کہ ان کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا اور ان کے کمسن کاندھوں پر گھر کی تمام ذمہ داریاں عود کر آئیں، لہٰذا انہیں اپنے سلسلۂ تعلیم کو منقطع کرنا پڑا۔ انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد واہی کلکتہ چلے گئے اور وہاں کے ایک مشہور کامرشیل انسٹی ٹیوٹ سے ۱۹۳۳ء میں ڈپلوما اِن کامرس کا کورس مکمل کر کے پٹنہ لوٹ آئے۔ اس ضمن میں خود، ان کا بیان ہے کہ:

''ابتدائی تعلیم بستی کے مڈل اسکول میں مکمل ہوئی، بستی کے سربرآوردہ افراد نے بستی

میں ہائی اسکول نہیں بننے دیا کہ مبادہ ان کے ملازموں کے لڑکے پڑھ لکھ کر مقابلے میں آجائیں، یہ خالص زمیندارانہ ذہنیت کی نشانی تھی، ان کے لڑکے تو علی گڑھ، بنارس اور پٹنہ میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ خاکسار بھی مڈل کے امتحان سے فارغ ہو کر پٹنہ آ گیا اور اس وقت کے اچھے اسکولوں میں شمار پٹنہ کالجیٹ میں داخل ہو گیا، وہاں سے میٹرک کرنے کے بعد پٹنہ کالج میں آ گیا اور وہیں سے تعلیمی سلسلہ ختم ہوا، پھر کلکتہ کے صوفی کمرشیل انسٹی ٹیوٹ میں ٹائپنگ اور شارٹ ہینڈ کی ڈگری حاصل کی، جو ملازمت کی بنیاد بنی''۔

(''رضا نقوی واہی: آئینہ در آئینہ'' مرتبہ: ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ص:۱۳۶-۱۳۷)

واہی نے جس گھرانے اور ماحول میں آنکھیں کھولیں، وہ زمیندارانہ تھا؛ لیکن ان کے مزاج وفطرت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا؛ بلکہ انہوں نے اپنی بستی کے ادبی وثقافتی ماحول سے اکتساب کرنا گوارا کیا۔ اس زمانے میں کھجوا اور اس کے مضافات میں ایک سے ایک جید عالم، فلسفی اور شاعر وادیب حضرات موجود تھے، جن کی قومی سطح پر پذیرائی ہوتی تھی۔ ان علماء وادبا کے فکر وفن سے انہوں نے گہرے اثرات قبول کیے۔ ان کی بستی اور اطراف میں مذہبی کے ساتھ ساتھ ادبی، سماجی اور ثقافتی جلسے بھی ہوتے تھے، جن میں واہی نہ صرف بہ نفس نفیس شریک ہوتے تھے؛ بلکہ تمام مقررین اور شعرائے کرام کے کلام اور بیان کو نہایت انہماک سے سنتے تھے۔ ان کی بستی شروع سے ہی علم وادب اور تہذیب وتمدن کا گہوارہ رہی۔ ایام عزا کے موقع پر ہر سال کھجوا بستی میں جید علماء، فقہا اور شعرائے کرام وغیرہ کی آمد بڑھ جاتی تھی۔ اس زمانے میں یہ بستی مذہبی کتابوں کی طباعت واشاعت کا خاص مرکز بھی تھی۔ واہی کے ذہین وفطین ذہن پر اپنے وطن اور مضافات کے علمی وادبی اور مذہبی ماحول کے گہرے اثرات مرتب ہوئے، جس کے باعث ان کے اندر علم وادب کے تئیں ایک خاص شغف پیدا ہوا اور وہ موزوں ناموزوں مصرعے مڈل اسکول کے زمانے میں ہی ترتیب دینے لگے تھے۔ رضا نقوی کو بچپن سے ہی اپنے گاؤں میں وہ ادبی ماحول ملا، جس سے ان کے ذہن کو جلا حاصل ہوئی، البتہ زمیندارانہ ماحول کی خامیاں وہاں بھی حاوی تھیں اور شاید ان خامیوں نے ہی رضا نقوی کو واہی بنا دیا اور واہی بننے کے بعد انہوں نے ان سماجی برائیوں کو اپنے طنز کا نشانہ بنایا۔ ان کے معاشرے کا ماحول کیسا تھا؟ اس بابت وہ خود فرماتے ہیں:

''میرے والد کا نام ظہور حسین تھا، وہ ابتدا میں پولیس انسپکٹر تھے؛ لیکن چھوٹے موٹے زمیندار خاندان کے آدمی تھے۔ ان لوگوں کا دماغ ہمیشہ عرش پر رہا کرتا تھا۔ ایک بار

انگریز ایس پی سے کسی بات پر جھڑپ ہوگئی تو انہوں نے اسے تھانے میں ہی بری طرح پیٹ دیا اور اس کے بعد مستعفی ہوکر گھر آ گئے۔ چھوٹی سی زمینداری تھی، اسی پر گزارا کرتے تھے؛ لیکن ان کی طبیعت میں ایڈونچر بہت تھا، لہٰذا زمینداری کا کچھ حصہ بیچ کر سیاحت کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ ایران، عراق، ترکی، مصر وغیرہ گئے۔ عراق میں ڈیڑھ دو سال کربلائے معلیٰ میں مقیم رہے۔ بعد میں ایران آ کر مشہد کے مقام پر دو تین سال مقیم رہے اور وہیں ہندوستانی قونصل میں مترجم کی حیثیت سے ملازمت بھی کی؛ لیکن ۱۹۱۲ء، یا ۱۹۱۳ء میں زار روس نے ایران پر حملہ کیا اور مشہد پر گولی باری کی تو جس مکان میں وہ تھے، اس مکان پر بھی ایک گولہ آ کر گرا، قریب پاس کے مکانات بھی منہدم ہوگئے۔ اس سے بددل ہوکر وہ پھر وطن واپس آ کر اپنی مختصر سی زمینداری پر گزر بسر کرنے لگے۔ عمر کے آخری ایام میں پٹنہ آ گئے اور یہیں ان کا انتقال ہوا''۔

(''ادب نکھار'' رضا نقوی واہیؔ نمبر، مئی جون ۱۹۸۳ء، ص: ۱۵)

پٹنہ کالج میں طالب علمی کے دوران ان کے اس علمی ذوق کو پروان چڑھنے کا خوب موقع ملا؛ کیوں کہ وہاں انہیں ان کی طبیعت اور مزاج کے موافق علمی و ادبی ماحول و فضا میسر آیا، باصلاحیت اساتذہ کرام کی معیت میں بہت کچھ سیکھنے اور سمجھنے کا موقع نصیب ہوا، کالج میں باصلاحیت، تعلیم یافتہ اور شعر و ادب کے دلدادہ ایسے دوست و احباب ملے، جو سبھی آگے چل کر اپنے فن کے ماہر اور استاد گردانے گئے۔ اختر اورینوی، زبیر احمد تمنائی، علی عباس، یحییٰ نقوی، شرف عظیم آبادی اور بہزاد فاطمی جیسے علم دوست حضرات کے درمیان واہیؔ کی بہت قدر تھی۔ طالب علمی کے مرحلے میں اساتذہ کرام کی نگاہوں میں بھی ان کی بڑی قدر و منزلت تھی۔

واہیؔ بچپن سے ہی اپنی بستی میں جس قدر شعری و ادبی تقاریب اور مذہبی محفلوں و مجلسوں میں شریک رہے، پٹنہ پہنچے تو اسکول اور کالج میں بھی وہ ماحول ملا، جس میں ان کے شاعرانہ مزاج کو مہمیز ملی، پٹنہ کالجیٹ اسکول کے استاد مولوی عین الہدیٰ ثمر نے ان کو شاعری کے اسرار و رموز سے آگاہ کیا، ثمر شعر و شاعری سے شغف رکھتے تھے، ان کی عروض و بلاغت پر گہری نظر تھی، انہوں نے ہی سب سے پہلے رضا نقوی کو عروض و بلاغت کے گر سکھائے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر عقیل اشرف لکھتے ہیں:

''عین الہدیٰ ثمرؔ بھی مذہبی مدرسہ سے فارغ تھے اور مولانا کہلاتے تھے، شاعر تھے

اور علم العروض پر اچھی دسترس رکھتے تھے۔ پٹنہ کے شاعروں کا وہ گروہ جو شاد شکنی پر آمادہ تھا، عین الہدیٰ ثمر ان میں سے ایک تھے، درجہ میں نظموں اور غزلوں کو پڑھاتے وقت شعری محاسن و معائب پر خصوصی توجہ دیتے تھے، قواعد و عروض کا سبق بہت ہی دلچسپی لے کر پڑھاتے تھے۔ اس طرح محمد رضا کو پہلی بار محاسن و معائب اور عروض و بلاغت کی فہم و فراست حاصل ہوئی''۔

(''رضا نقوی واہیؔ: آئینہ در آئینہ'' مرتبہ: ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ص: ۲۸۲)

پٹنہ کالجیٹ کے ذی علم اور تجربہ کار اساتذہ کی صحبت میں ان کا ادبی ذوق پروان چڑھا۔ اس کے بعد وہ جس کالج میں داخل ہوئے، اس کا شمار اس زمانے میں نہ صرف عظیم آباد کی مشہور دانش گاہوں میں؛ بلکہ ملک کے معیاری تعلیمی اداروں میں ہوتا تھا۔ پٹنہ کالج کی ایک خاص پہچان تھی اور وہاں کی علمی و ادبی بزم کو انفرادیت حاصل تھی۔ وہاں ادبی نشستوں اور مشاعروں نیز علمی اور اخلاقی تقاریب کا ایک سلسلہ رہتا، جس میں شعر و ادب کی مایہ ناز ہستیاں شریک ہوتی تھیں۔ پٹنہ یونیورسٹی کے مختلف کالجوں کی تقریبات، جلسے اور مشاعرے سے واہیؔ کو بھرپور طریقے سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ واہیؔ کے یارِ غار معروف شاعر اور نبیرۂ شاد بہزاد فاطمی اس دور میں یونیورسٹی کی ادبی سرگرمیوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''بزم ادب، پٹنہ کالج اور بزم سخن، سائنس کالج کے سالانہ جلسے اور مشاعرے بڑے اہتمام اور شان و شوکت سے منعقد ہوتے۔ بی این کالج اور مدرسہ شمس الہدیٰ میں بھی بہت اچھے مشاعرے ہوتے۔ مقامی اور غیر مقامی شعرا اور اساتذہ مدعو ہوتے، ہوٹنگ کے مرض نے شدت اور وبائی شکل اختیار نہ کی تھی، بقدر پیمانۂ فکر مناسب اور برمحل داد ملتی۔ کبھی کبھی طلبہ اور نوجوانوں کو خوش طبعی کے مواقع بھی مل جاتے بسا اوقات برجستہ جواب پاتے''۔

(''رضا نقوی واہیؔ: آئینہ در آئینہ'' مرتبہ: ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ص: ۲۹)

ان کالجوں کے علمی و ادبی تقاریب کے انعقاد میں طلبہ کے ساتھ ساتھ اساتذہ کرام بھی پیش پیش رہتے تھے، پٹنہ کالج کے ایک ہونہار طالب علم کے طور پر واہیؔ بھی ان میں سرگرم عمل ہوا کرتے تھے۔ اپنے زمانۂ تعلیم کے ادبی ماحول کے بارے میں خود واہیؔ لکھتے ہیں:

''ہم لوگ کلاس روم میں لکچر سننے کے بجائے مشق سخن کیا کرتے تھے۔ پٹنہ کالج کی بزم ادب اور سائنس کالج کی بزم سخن کے اکثر مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ بزم ادب کے طرحی مشاعرے میں، میں نے پہلی غزل پڑھی تھی، جو بے حد پسند کی گئی اور اس کے بعد مجھ میں خود اعتمادی پیدا ہوگئی''۔

(''ادب نکھار'' مئو ناتھ بھنجن، رضا نقوی واہی نمبر، ص:۱۴)

پٹنہ کالج کے اساتذۂ کرام کی خصوصی توجہ و تربیت اور پٹنہ یونیورسٹی کے دیگر کالجوں کی بزم آرائیاں اور ادبی سرگرمیاں ان کے تخلیقی ذہن کو نکھارتی اور سنوارتی رہیں۔ کالج میں پروفیسر حافظ عبد المنان بیدل اور پروفیسر حافظ شمس الدین شمس منیری جیسے قادر الکلام شعرا ان کے استاد تھے، جن کی سرپرستی، تربیت اور حوصلہ افزائی سے علمی و ادبی میدان میں انہیں نہ صرف نئی سمت و رفتار ملی؛ بلکہ ان کے اختراعی صلاحیت وقوت اور علمی استعداد میں بھی روز افزوں اضافہ ہوتا گیا۔ رضا نقوی مذکورہ بزرگ اساتذۂ کرام سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔ یہ وہ اساتذہ تھے، جو طلبہ کے اصلاح سخن میں زیادہ دلچسپی لیتے تھے اور چاہتے تھے کہ شاگردوں میں نہ صرف ذوق شعری پیدا ہو؛ بلکہ وہ اچھے شاعر بھی بنیں، لہٰذا وہ اپنے کالج میں اکثر طرحی مشاعرے کرواتے اور نو واردان ادب کو مصرعۂ طرح دے کر طرحی غزلیں کہلواتے تھے۔ واہی نے اس طرح کی سرگرمی کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ایک مرتبہ بیدل صاحب نے جوش کی ایک غزل جس کی ردیف جھلکتا ہے اور تو، بو، سو، اس کا قافیہ تھا۔ مجھے حکم دیا کہ اس زمین میں غزل لکھو۔ غزل لکھنے پر آٹھ آنے انعام دینے کا وعدہ کیا۔ میں نے غزل لکھی، غالباً گیارہ اشعار کی غزل تھی۔ دوسرے روز ہم نے غزل سنائی۔ دو اشعار کو انہوں نے مہمل قرار دیا، بقیہ نو اشعار پر انعام دینے کی منظوری دی۔ ابھی مجھے انعام حاصل نہیں ہوا تھا کہ دوسرے دن یحییٰ نقوی کو ان کی غزل پر ایک روپیہ انعام دینے کا وعدہ کیا۔ ہم دونوں شام کو بیدل صاحب کے گھر گئے اور ان سے ڈیڑھ روپے انعام کے وصول کیے اور پھر ان سے جلیبیاں خریدی گئیں اور کافی لوگوں کے بیچ میں کھائی گئیں۔ یہ پہلا انعام تھا، جو ہم کو شاعری پر ملا''

(غیر مطبوعہ ''تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ ڈی'' از: ڈاکٹر عقیل اشرف)

واہی کا قیام مسلم ہاسٹل (اب اقبال ہاسٹل) میں تھا اور ان کے کمرے میں عظیم آباد کے

نو جوان شعرا و ادبا کا جم گھٹا لگا رہتا تھا، جن سے پیہم ادبی موضوعات پر تبادلۂ خیالات ہوا کرتا۔ اس دوران انہیں جگر مراد آبادی، ساغر نظامی، مجاز لکھنوی، بسمل الٰہ آبادی، فطرت واسطی، نشور واحدی اور روش صدیقی جیسی باکمال شخصیات کو قریب سے دیکھنے اور سننے کا موقع ملا اور وہ فطری طور پر ان فنکاروں سے متاثر ہوئے۔ اس ماحول میں ان کی ذہنی تشکیل و تعمیر ہوئی اور انہوں نے باقاعدہ شاعری شروع کی۔ ۱۹۳۲ء میں پٹنہ کالج کی ''بزم ادب'' کے ایک سالانہ مشاعرے میں محمد رضا نقوی نے اپنی غزل ''آیا تھا لے کے عالم امید دہر میں'' پڑھی تو سامعین و احباب انگشت بہ دنداں رہ گئے اور انہیں خوب داد و تحسین سے نوازا گیا۔ اس غزل کے ان اشعار کی خوب پذیرائی ہوئی:

آیا تھا لے کے عالم امید دہر میں
اب جا رہا ہوں یاس کی دنیا لیے ہوئے
کانٹوں بجھا لو پیاس کہ راہ دراز سے
آیا ہوں جام آبلۂ پا لیے ہوئے

سامعین کرام کی داد و تحسین سے ان کے حوصلے کو توانائی، اعتماد کو پختگی اور شاعرانہ شعور کو سمت و رفتار ملی۔ ان کا آبائی وطن ایک بڑا ادبی و مذہبی مرکز تھا، جہاں مسلسل ادبی و مذہبی تقریبات کا انعقاد ہوتا رہتا تھا۔ رضا نقوی چھٹیوں میں جب وہاں جاتے تو ان پروگراموں میں حصہ لیتے، بستی کی لائبریری سے ادبی کتابیں حاصل کر کے ان کا مطالعہ کرتے۔ بہار میں کھجوا اہل تشیع کی ایک معروف تہذیبی بستی ہے، جہاں سے ان کا مذہبی رسالہ ''اصلاح'' کے نام سے نکلتا تھا، یہ مشرقی ہند سے شائع ہونے والا اردو کا قدیم ترین رسالہ تھا، اس کے دفتر میں ملک اور بیرون ملک کے مشہور اخبارات و رسائل آتے تھے، جنہیں پڑھنے کے انہیں خوب مواقع ملے اور انہوں نے اپنے فن کی کشید کی اور آگے چل کر اپنے ادبی و تعلیمی مشن میں کامیابی سے ہمکنار ہوئے۔

انٹرمیڈیٹ کی تکمیل کے بعد گھریلو حالات کچھ ایسے ناگفتہ بہ ہوئے کہ وہ آگے کی تعلیم کو جاری نہ رکھ سکے۔ ان کے والد سید ظہور حسین میں مستقل مزاجی نہیں تھی۔ جائداد ملی تو آپسی تنازعات بھی ورثے میں ملے، جس کے سبب مقدمات کی الجھنوں میں گرفتار ہوئے۔ محکمۂ پولس میں انسپکٹر بنے؛ لیکن مزاج کے افتاد کے سبب ایک انگریز پولس افسر کی پٹائی کر دی، جس کے باعث انہیں ملازمت سے مستعفی ہونا پڑا۔ چھوٹی سی زمینداری تھی اور خاندان بھی مختصر تھا؛ مگر سیمابی کیفیت کی وجہ سے زمینداری کا کچھ حصہ

فروخت کر کے ایران، عراق، ترکی اور مصر کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ عراق گئے تو وہیں ڈیرہ خیمہ ڈال دیا، پھر ایران پہنچے تو ہندوستانی قونصل میں ملازمت اختیار کر لی؛ مگر جنگ کے سبب وہاں سے وطن واپس لوٹ آئے۔ ان سب کا اثر رضا نقوی کی تعلیم پر پڑا اور وہ اپنے تعلیمی سلسلہ کو منقطع کر کے تلاش معاش کے سلسلے میں کلکتہ چلے گئے۔

ان دنوں کلکتہ کا ادبی ماحول شباب پر تھا۔ ادبی بساط پر وہاں علامہ وحشت کلکتوی، علامہ جمیل مظہری، اجتبیٰ رضوی، پرویز شاہدی، عباس علی خاں بیخود عظیم آبادی، ل۔ احمد اکبر آبادی جیسی ہستیاں سرگرم تھیں، جن کے درمیان نوجوان رضا نقوی کو اٹھنے بیٹھنے کا خوب موقع ملا۔ علامہ جمیل مظہری جو رضا نقوی کے ہم وطن تھے، وہ کلکتہ میں ان کا سہارا بنے، انہوں نے کلکتہ کے ادبی حلقوں میں رضا نقوی کو متعارف کرایا، اس وقت تک رضا نقوی باقاعدہ سنجیدہ شاعری شروع کر چکے تھے: اس لیے وہاں کی شعری نشستوں، مشاعروں اور ادبی جلسوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے لگے۔ کلکتہ کے صوفی کمرشیل انسٹی ٹیوٹ سے ڈپلوما اِن کامرس کی سند حاصل کر کے، وہ پٹنہ واپس لوٹ آئے۔

پٹنہ آکر وہ ملازمت کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے۔ خدا بخش لائبریری کے نزدیک ایک چھوٹے سے کمرہ میں رہائش اختیار کی، یہ کمرہ اس قدر چھوٹا تھا کہ ان کے دوست واحباب اسے کمرہ نہیں؛ بلکہ پنجڑہ کہتے تھے؛ لیکن رضا نقوی کی منکسر المزاجی، خوش طبعی، خلوص اور ملنساری کے سبب اس تنگ کمرے میں بھی آنے جانے والوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ اس دوران ایک ماہنامہ ادبی رسالہ کی اشاعت کا منصوبہ بنا، رسالے کا نام ''شمیم'' تجویز ہوا، اس کے مدیر زبیر احمد تمنائی بنائے گئے، اس کی طباعت کا اہتمام زبیر احمد تمنائی، رضا نقوی، اختر اورینوی، علی اطہر، شرف عظیم آبادی، نادم بلخی، یحییٰ نقوی وغیرہ کی مشترکہ کاوشوں سے ہوا کرتا تھا۔ اتنا سرمایہ کسی کے پاس نہیں تھا، لہٰذا اس کی اشاعت کا انتظام بقول رضا نقوی ''پنچایتی'' انداز کا تھا، کچھ احباب چندہ جمع کرتے، کچھ اہل ثروت سے عطیات لاتے، جس سے اس کی اشاعت ہوتی۔ ''شمیم'' کی ادبی حلقے میں خوب پذیرائی ہوئی؛ لیکن اس کے آٹھ، نو شمارے ہی منظر عام پر آ سکے۔ زبیر احمد تمنائی کے پٹنہ کو خیر باد کہہ دینے سے اس کی اشاعت بند ہو گئی۔ پروفیسر نادم بلخی نے اس رسالہ کی یاد اس طرح تازہ کی ہے:

> ''ہم لوگ کبھی کبھی بیٹھ کر نئی نئی اسکیمیں بناتے تھے۔ ایک منصوبہ یہ بنا کہ پٹنہ سے ایک ادبی ماہنامہ جاری کیا جائے۔۔۔ زبیر احمد تمنائی اپنے گھر سے تین چار سو روپے لائے،

> میں اپنی بیگم سے کچھ زیورات اس بہانے سے مانگ کر لایا کہ انہیں فروخت کر کے نئے ڈیزائن کے زیورات خریدے جائیں، یحییٰ نقوی کچھ رقم لائے۔۔۔ آٹھ، نو سو روپے اکٹھا ہوئے، جس سے رسالہ ''شمیم'' کی اشاعت شروع کی گئی۔ ''ادب لطیف'' اور ''نگار'' میں (اس پر) تبصرے شائع ہوئے۔ آخری شمارہ نکلنے تک کاتب کی اجرت اور پریس کا قرض لد گیا۔۔۔ ایک خبر ملی کہ تمنائی صاحب پٹنہ سے غائب ہیں، جس کمرہ میں ''شمیم'' کا دفتر تھا۔۔۔ کرایہ نہ ملنے کے سبب مکان مالک نے ضبط کر لیا''۔

(''رضا نقوی واہیؔ: آئینہ در آئینہ'' ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ص:۴۲)

اس طرح اوائل عمری میں ہی رضا نقویؔ کے ادارتی شغل کا خاتمہ ہو گیا؛ لیکن وہ پٹنہ کی دیگر ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے؛ مگر اصل مسئلہ تو معاش کا تھا، جس کے حل کی صورت یہ نکلی کہ ۱۹۳۷ء میں ان کی تقرری بہار لجس لیٹیو اسمبلی میں اردو رپورٹر کی حیثیت سے ہو گئی، جہاں ۳۵/ برس ملازمت کرنے کے بعد وہ اسسٹنٹ سکریٹری کے عہدے سے ۱۹۷۲ء میں سبکدوش ہوئے۔

۱۹۳۸ء میں رضا نقویؔ نے اپنے خاندان کی ہی لڑکی سیدہ شاکرہ خاتون (وطن قصبہ بگھونی، ضلع سیوان) سے شادی کی۔ یہ بہت ہی شریف النفس اور صابر وشاکر خاتون تھیں، جنہوں نے ہر قدم پر شوہر کا ساتھ دیا، ان کی بے محل اور بے جا فرمائشیں پوری کیں اور گھر کو گل وگلزار بنائے رکھا۔ یہ حقیقت ہے کہ رضا نقوی واہیؔ کی عظمت وسربلندی میں ان کی بیگم سیدہ شاکرہ خاتون کی ایثار ومحبت اور عملی تعاون کا دخل زیادہ رہا ہے، خدا نے انہیں سید علی رضا نقوی، سید احسن رضا نقوی، سید عابد رضا نقوی، سید جعفر رضا نقوی، سید موسیٰ رضا نقوی، رضیہ فاطمہ، مرضیہ فاطمہ اور ذکیہ فاطمہ جیسی صالح اور سعادت مند اولادیں عطا کیں۔

رضا نقوی واہیؔ بیحد خلیق، مشفق، منکسر، حلیم، خوش مزاج، مہمان نواز، وسیع القلب، انسان دوست، ادیب نواز، دردمند، محبّ قوم وملک اور ہمہ گیر شخصیت کے حامل انسان تھے۔ پروفیسر اختر اورینوی نے ان کی شخصیت کی عکاسی کچھ یوں کی ہے:

> ''واہیؔ صاحب نہایت ہی مہذب اور شائستہ شخص ہیں۔ بڑے وضع دار، نرم مزاج؛ مگر بے باک، بااخلاق؛ مگر کھرے، نہایت گہری نظر رکھنے والے؛ مگر پُرسکون، حساس اور متوازن''۔

جس سے ملتے ٹوٹ کر ملتے تھے، حالاں کہ ان کے کاندھے پر ایک بڑے خاندان کی ذمہ داری تھی۔ اس کے باوجود وہ کتنے ہی طلبہ کی کفالت اور مفلوک الحال ادبا و شعرا کی ممکن حد تک مدد کرتے تھے۔ ہمیشہ ہنسنے ہنسانے، دعوت کھلانے اور بغیر مانگے دینے والے اس پاک طینت انسان کے گھر پر ہمیشہ کسی نہ کسی ادیب، یا شاعر کا قیام رہتا تھا؛ مگر ان کی اہلیہ اور بچوں کے چہرے پر کبھی شکن نہیں آتی تھی، ان کا دسترخوان بہت وسیع تھا، وہ ادبا و شعرا کو پکڑ پکڑ کر گھر لاتے تھے۔ بقول شفیع مشہدی:

''رضا صاحب کی ادب نوازی کا یہ عالم ہے کہ وہ صبح سویرے گردنی باغ کے چوراہے پر چلے آتے ہیں اور پانچ دس منٹ کے اندر کوئی نہ کوئی شاعر، ان کے ہاتھ لگ جاتا ہے، جسے وہ پکڑ کر گھر لے آتے ہیں، بڑی شفقت سے اسے بٹھاتے ہیں، ناشتہ کرواتے ہیں، چائے پلواتے ہیں اور پھر اس کا کلام سنتے ہیں، مہمل اشعار پر بھی جی کھول کر داد دیتے ہیں۔ شاعر جب تھک جاتا ہے تو اسے پھر سے چائے پلواتے ہیں، پان کھلواتے ہیں اور پھر شعر سنتے ہیں۔ مکرر ارشاد کی تکرار کے بعد جب شاعر نڈھال ہو جاتا ہے تو اسے خوب مرغن کھانا کھلاتے ہیں؛ مگر کھانا کھا کر اسے آرام کرنے کا موقع نہیں دیتے اور اس سے پھر کلام سنتے ہیں۔ شام تک شاعر اپنی شاعری بھول جاتا ہے، اس کا رنگ زرد ہو جاتا ہے اور اس کی قوت گویائی ختم ہو جاتی ہے تو اسے اُبلے ہوئے انڈے کھلا کر چائے پلواتے ہیں اور تب اسے اپنی ایک نظم سنا کر گویا اسے کورامن کا انجکشن دے دیتے ہیں؛ تاکہ وہ اپنے گھر تک واپس جا سکے۔ روایت تو یہ ہے کہ کچھ شعرا نے اس مہمان نوازی سے جانبر ہونے کے بعد شاعری ترک کر دی ہے؛ بلکہ ترک وطن کر دیا ہے؛ تاکہ دوبارہ اس آزمائش میں مبتلا نہ ہو سکیں۔ دروغ بر گردن راوی؛ لیکن یہ حقیقت ہے کہ سہرسہ کے ایک کہنہ مشق بزرگ شاعر کو واہیؔ صاحب نے ۱۷ دنوں تک اس آزمائش میں مبتلا رکھا تھا۔ شاعر موصوف بھی ایسے سخت جان تھے کہ انہوں نے شکست نہ مانی اور اٹھارہویں دن خود رضا نقوی صاحب کان کے درد میں مبتلا ہو گئے۔ ڈاکٹروں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ تین ماہ تک شعر سننے سے پرہیز کریں، چنانچہ تین ماہ تک شاعروں کو اس ابتلا سے نجات ملی؛ لیکن تین ماہ کی مدت پوری ہونے کے بعد پھر وہی سلسلہ دار و گیر جاری ہے۔''

(''رضا نقوی واہیؔ: آئینہ در آئینہ'' مرتبہ: ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ص: ۹۹-۱۰۰)

بلا شبہ واہیؔ کا دسترخوان وسیع تھا، وہ خود کھانے پینے کے شوقین تھے اور کھلانے پلانے کے معاملے میں بھی فراخ دل تھے۔ مہمانوں کی ضیافت خوشدلی سے کرتے تھے؛ اسی لیے اکثر ان کے دسترخوان پر کوئی نہ کوئی مہمان ضرور ہوتا تھا۔

واہیؔ صاحب کی سرشت میں شوخی، بذلہ سنجی اور خوش مزاجی شامل تھی؛ اس لیے وہ جس محفل میں پہنچتے اسے زعفران زار بنا دیتے تھے۔ ہر مجلس میں ان کے چاہنے والوں کی بھیڑ یکجا ہو جاتی اور بڑے ذوق وشوق سے ان کو سننا پسند کرتی تھی، ان میں ہنسنے اور ہنسانے کے علاوہ بعض ایسی طرب انگیز خوبیاں پوشیدہ تھیں، جو ہمیشہ دلوں کو جوڑتی اور اپنی جانب کھینچتی رہیں۔ واہیؔ بے حد حاضر جواب اور حاضر دماغ بھی تھے۔ پروفیسر اختر اورینوی نے غالب صدی (۱۹۶۹ء) کے موقع پر پٹنہ یونیورسٹی میں غالب سیمینار کا اہتمام کیا تھا، جس میں سید احتشام حسین، آل احمد سرور کے علاوہ لکھنؤ سے احمد جمال پاشا بھی تشریف لائے تھے۔ پاشا مزاح نگار تھے؛ اس لیے واہیؔ صاحب کی دلچسپی ان میں تھی۔ احمد جمال پاشا، اختر اورینوی کی سرکاری رہائش گاہ چھجو باغ میں قیام پذیر تھے۔ واہیؔ صاحب نے معروف افسانہ نگار وصحافی رضوان احمد کو یہ ذمہ داری سونپی کہ وہ سیمینار کے بعد پاشا کو چھجو باغ سے لے کر ان کے گھر تک پہنچا دیں، جہاں وہ دو چار دنوں تک ان کے مہمان رہیں گے۔ رضوان احمد صبح صبح رکشہ سے انہیں چھجو باغ سے لے کر گردنی باغ پہنچے۔ انہیں دیکھ کر واہیؔ صاحب کھل اٹھے تو احمد جمال پاشا نے کہا 'رضوان صاحب کے ساتھ چھجو باغ سے گردنی باغ تک تو آ گیا ہوں، اب دیکھئے کہاں لے جاتے ہیں'۔ اس پر واہیؔ صاحب نے برجستہ فرمایا کہ چھجو باغ سے گردنی باغ تک نہیں؛ بلکہ قادیان سے کربلا تک آ گئے ہیں۔ (واضح رہے کہ اختر اورینوی قادیانی تھے اور رضا نقوی واہیؔ اہل تشیع) اس پر دونوں دل کھول کر ہنسنے لگے۔

رضا نقوی صرف مزاحیہ نظمیں نہیں لکھتے تھے؛ بلکہ عملی مزاح کے بھی قائل تھے۔ اکثر اوٹ پٹانگ اور بے سر و پا قسم کا کلام کہہ کر کسی استاد شاعر کے نام سے مقامی اخبارات میں شائع کروا دیتے تھے اور وہ ثقہ شاعر قسمیں کھاتا پھرتا کہ یہ اس کا کلام نہیں، ایسا اوٹ پٹانگ کلام اس کا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کی مشق واہیؔ نے طالب علمی کے زمانے سے ہی شروع کر دی تھی، آگے چل کر ان کی تحریک پر صنعت معریٰ عن المعنی؛ یعنی بے معنی اشعار کہنے کی مہم چلائی گئی، کچھ انفرادی اور کچھ پنچایتی کوششوں سے اس مہم نے بعض موقعوں پر شاندار کامیابی حاصل کی۔ واضح رہے کہ اس قبیل کی تحریک کا سہرا ان پنچایت والوں کے سر نہیں رکھا جا سکتا؛ اس لیے کہ اس کی بنیاد آتش کے زمانے میں پڑ چکی تھی:

مورچہ مخمل میں باندھا، آدمی بادام میں
ٹوٹی دریا کی کلائی ، زلف الجھی بام میں

شادعظیم آبادی نے بھی اپنے دورِ شباب میں بے تکلف دوست واحباب کی تفریحِ طبع کے لیے اس قسم کی شاعری کے نمونے پیش کیے ہیں، اس کا ذکر ''شاد کی کہانی شاد کی زبانی'' میں موجود ہے۔ واہی لکھتے ہیں:

''ان بزرگ اساتذہ کی سعی کامراں، محض سخن ناشناسوں کی آزمائش اور انبساط طبیعت کے لیے تھی، اس صنف سخن کی کوئی ارتقائی، یا بالیدہ شکل سامنے نہیں آئی ہے، اراکین پنچایت نے اسے بطور فن اختیار کیا ہے اور بہت سے نادر نمونے پیش کیے۔ صنعت معریٰ عن المعنی میں اشعار کی تخلیق سے پہلے پنچایت میں یہ فیصلہ ہوتا تھا کہ کس رکن اور اراکین کو ملا کر اس وقت کے کس کس اہم، مشہور اور مقبول شاعر کے لباس سخن میں طبع آزمائی کرنی ہے اور کون سا مقام اس طبع آزمائی کی نوازش کے لیے موزوں ہوگا؛ تاکہ بہتر سے بہتر داد و تحسین کے انعامات مل سکیں۔ ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہیں، اس کے علاوہ بامعنی الفاظ کی بے معنی نشست، تشبیہوں اور استعاروں کا بہ ظاہر حسن کارانہ استعمال اور تمام لوازمات شاعری کی پابندی کے ساتھ ایسے اشعار کی تخلیق، جو طلوع آفتاب کے وقت دریا کی سبک رو موجوں کی طرح جگمگاتے اور چمکتے نظر آئیں؛ لیکن ذرا ڈوب کر دیکھا جائے تو دریا کے معنی کا کوئی مول پتہ نہیں، بہت مشکل ہے۔''

(''ادب نکھار'' مئوناتھ بھنجن، رضا نقوی واہی نمبر، ص: ۳۷-۳۸)

رضا نقوی واہی اس بے معنی شاعری میں مہارت رکھتے تھے، وہ عموماً بے معنی غزلیں اور نظمیں کہہ کر مقامی اخباروں میں نستعلیق شعرا کے نام سے شائع کرادیتے تھے اور وہ شعرانہ صرف کافی واویلا مچاتے؛ بلکہ اخبار کے مدیر کے پاس لڑنے جھگڑنے تک کو پہنچ جایا کرتے تھے۔ حضرت مدیر صفائی دیتے رہتے کہ آپ جیسے کہنہ مشق شاعر کی تخلیق دیکھ کر میں نے بغیر دیکھے ہی کاتب کو دے دی کہ اس میں کسی غلطی کا امکان ہی نہیں۔ بہر حال اس سے ادبی حلقوں میں کچھ دنوں تک خوب دھما چوکڑی رہتی اور حضرت واہی اپنی شرارت پر زیر لب مسکراتے رہتے۔

انہوں نے عملی ظرافت کا نمونہ بھی خوب پیش کیا ہے۔ ایک بار رسالہ ''ساقی'' دہلی میں ان کی

ایک نظم طبع ہوئی، جس میں کتابت کی وافر غلطیاں راہ پا گئی تھیں، انہوں نے جھلا کر ایک نظم لکھ ڈالی۔ ''حضرت کاتب شہ اقلیم کتابت'' اور وہ نظم مدیر ''ساقی'' شاہد احمد دہلوی کی خدمت میں روانہ کردی، کچھ عرصہ بعد مدیر محترم نے انہیں اپنے مکتوب کے ذریعہ یہ اطلاع دی کہ ان کی نظم سے بد حظ ہو کر کاتب حضرات اس کی کتابت کے لیے آمادہ نہیں ہیں اور انہوں نے مشترکہ دستخط سے اپنا فیصلہ انہیں ارسال کیا ہے۔ اس کو پڑھ کر واہی نے ایک جوابی نظم بھی تخلیق کی۔ وہ دونوں نظمیں ''حضرت کاتب'' اور ''عرض کاتب'' کے عنوان سے منظر عام پر آئیں۔

پٹنہ کے سبزی باغ میں واقع ''رحمانیہ ہوٹل'' میں ان دنوں ادبا وشعرا کی محفلیں خوب سجا کرتی تھیں۔ ہمہ وقت وہاں ادبا وشعرا، ناقدین اور صحافیوں کا جمِ غفیر رہتا تھا۔ وہ جدیدیت کے عروج کا زمانہ تھا۔ ایک دن ایک افسانہ نگار اور نوجوان ناقد کے درمیان نہ صرف گرما گرم بحث ہوئی؛ بلکہ نوبت دھینگا مشتی تک پہنچ گئی۔ واہی کو جب یہ خبر ملی تو ان کے اشہب قلم سے ایک نظم وجود میں آ گئی اور وہ نظم ''جدید عملی تنقید'' کے عنوان سے شائع ہوئی۔

ملازمت سے سبکدوشی کے بعد واہی تقریباً ۲۸ ربرسوں تک بقید حیات رہے۔ وہ بظاہر ہشاش بشاش نظر آتے تھے؛ لیکن بہ باطن سخت علیل رہتے تھے۔ بالکل خانہ نشیں ہو گئے تھے، کسی نشست، یا مشاعرے میں شرکت سے اجتناب برتنے لگے تھے۔ دراصل انہیں ان دنوں ایسا عارضہ لاحق ہو گیا تھا، جس میں بھیڑ بھاڑ سے سخت وحشت ہوتی تھی۔ ریل، موٹر، رکشہ کسی سواری کے سفر سے احتراز کرتے تھے، کبھی کبھار کسی ریڈیو پروگرام میں شرکت کا ارادہ کرتے تو اس کے لیے صبح سے ہی تیاری شروع ہو جاتی کہ کس طرح جائیں گے اور کب واپس آئیں گے، بارہا ایسا ہوا کہ وحشت طاری ہونے پر راستے سے ہی واپس لوٹ گئے۔

وہ عام طور سے پیٹ کے عارضہ میں گرفتار رہتے تھے۔ مشہور طبیب اور شاعر حکیم غبار بھٹی انہیں ماء اللحم پلاتے اور طرح طرح کے معجون مرکب کھلاتے تھے۔ واہی صاحب کی رگ ظرافت پھڑکی تو انہوں نے ان کی طبابت کا مذاق اڑاتے ہوئے ایک نظم ''ماء اللحم'' لکھ ڈالی۔ اپنی بیماریوں کا ذکر وہ لوگوں سے خوب کیا کرتے تھے۔ ۱۹۶۸ء میں انہیں حیدرآباد سے بلاوا آیا تو اپنی بیماری کا بہانہ بنا کر اس سفر کو ٹالنے کی خوب کوشش کی؛ لیکن مجتبیٰ حسین کی ضد کے آگے مجبور ہو گئے، مجتبیٰ حسین نے اپنے خاکے میں واہی کے سفر حیدرآباد کا ذکر یوں کیا ہے:

''واہی صاحب کو ایک بار ہم نے حیدر آباد بلایا تھا، بڑی مشکل سے آئے، عذر یہ پیش کرتے تھے کہ ان کی صحت ٹھیک نہیں ہے۔ انہوں نے اپنی صحت کی خرابی کا اعلان کچھ اس زور و شور سے اور تفصیل سے کیا تھا کہ ہم اسٹریچر لے کر انہیں لینے اسٹیشن پہنچے؛ بلکہ ایک ڈاکٹر بھی حفظ ما تقدم کے طور پر اپنے ساتھ رکھا۔ یہ ٹرین سے اترے تو دیکھا کہ ایک نہایت صحت مند آدمی سامنے کھڑا ہے، سخت مایوسی ہوئی، اسٹیشن سے واپسی میں ہم اسٹریچر پر آئے اور وہ ٹیکسی میں، جتنے دن حیدر آباد میں رہے، دھما چوکڑی مچائے رہے، سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کب بیمار رہتے ہیں، حیدر آباد میں قیام کے دوران میں ایسی صحت مند حرکتیں کیں کہ ہم دنگ رہ گئے''۔

(''رضا نقوی واہی: آئینہ در آئینہ'' مرتبہ: ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ص:۸۹)

آگے چل کر مجتبیٰ حسین نے ان کی صحت مندی کے متعلق یوں لکھا ہے:

''ہمیں تو اس وقت مایوسی ہوئی تھی، جب یہ اپنی بیماری کے لگاتار اعلان کے باوجود ہمیں صحت مند دکھائی دئے تھے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ اپنی بیماریوں کا اعلان محض بیماریوں کے جراثیم کو دھوکہ دینے کے لیے کرتے ہیں؛ یعنی گلے میں بیماریوں کے سلسلے میں ''ہاؤس فل'' کی تختی لگا دی جائے تو جراثیم خود بہ خود کسی دوسرے جسم کی طرف رجوع کریں گے''۔

(ایضاً، ص:۹۰)

واہی کے سلسلے میں مجتبیٰ حسین کا یہ مفروضہ درست نہیں۔ سچائی تو یہ ہے کہ وہ بظاہر بالکل صحت مند اور ہشاش بشاش نظر آتے تھے؛ لیکن اندر سے کئی عارضے میں مبتلا تھے۔ وہ دوسروں کو تو ہنساتے رہے؛ مگر اندر ہی اندر متعدد عارضے انہیں دیمک کی طرح چاٹتے رہے۔ ۱۹۷۲ء کے بعد وہ اپنے گھر کی چہار دیواری تک محدود ہو گئے تھے؛ مگر اس کے باوجود ان کی بذلہ سنجی اور حسِ مزاح میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ تادمِ حیات قہقہوں اور مسکراہٹ کی دولت بانٹتے رہے۔ زندگی بھر صبح سے شام؛ بلکہ دیر رات تک یہی کام کرتے رہے۔ انہوں نے گھر سے نکلنا ترک کر دیا تھا؛ مگر ان کے یہاں لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ بنا ہوا تھا۔ وہ خود، ان کے صاحبزادے اور پوتے پوتیاں مہمانوں کی خاطر مدارات میں خوش دلی سے سرگرداں رہتے۔ اپنی فیاضانہ فطرت کی وجہ سے پٹنہ میں طویل قیام کے باوجود وہ اپنا ذاتی مکان تک نہیں بنوا سکے، اس کا انہیں قطعی ملال بھی نہیں تھا۔ ان کے صاحبزادے سید عابد رضا نقوی اپنے مضمون میں رقم طراز ہیں:

''آپ نے مال دنیا کو کبھی خاطر میں نہیں رکھا، بس اتنا ہی چاہا کہ زندگی کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوتی رہیں، یہی وجہ ہے کہ پٹنہ کے ساٹھ سالہ قیام کے دوران آپ دو کمرے کا ایک مکان بھی حاصل نہ کر سکے، یہ ہماری شکایت نہیں؛ بلکہ آپ کے مزاج کے ایک رخ کی نشاندہی ہے''۔

(ایضاً، ص:۱۱۱)

رضا نقوی واہی صبر و قناعت کے پیکر تھے۔ وہ خود سے زیادہ دوسروں کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے۔ انسانیت کے شیدائی تھے اور تا زندگی وہ اس پر کاربند رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مضافات کے لوگ بھی انہیں شدت سے چاہتے تھے۔ پٹنہ کے جس علاقے میں وہ اقامت پذیر تھے، وہاں کے باشندگان میں صرف ان کا خاندان اکلوتا مسلم خاندان تھا؛ مگر فرقہ وارانہ فساد اور مذہبی جنون کے دور میں بھی وہ وہیں رہے اور کسی نے ان کے مکان کی طرف نگاہِ بد بھی نہ ڈالی۔ رضا نقوی نے خود ایک واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ جس زمانے میں فرقہ وارانہ صورت حال بے حد خراب تھی، وہ اپنے گھر سیوان گئے اور وہیں پھنس کر رہ گئے۔ پٹنہ میں ان کی ہم سایہ بیوہ برہمن خاتون کو بے حد پریشانی ہوئی، جسے وہ ''اماں'' کہتے تھے اور وہ بھی واہی صاحب کو اپنا تیسرا بیٹا مانتی تھی، اس کا ایک بیٹا پولس افسر تھا، جب رضا صاحب سیوان سے واپس نہیں آئے تو اس نے اپنے پولس افسر بیٹے سے کہا، وہ جائے اور انہیں لے کر آئے۔ بیٹے نے لاکھ سمجھایا کہ رضا صاحب آ جائیں گے، تشویش کی کوئی بات نہیں ہے؛ لیکن اس نے بات ماننے سے انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ جب تک رضا نہیں آئیں گے، وہ کھانا نہیں کھائے گی۔ جب ماں نے بھوک ہڑتال کر دی تو مجبوراً پولس افسر بیٹے کو خود جانا پڑا اور فسادیوں کے درمیان سے رضا صاحب اور ان کے اہل خانہ کو بہ حفاظت لے کر آنا پڑا، اس کے بعد اس برہمن خاتون نے تین ماہ تک انہیں اپنے ہی گھر میں رکھا اور جب حالات معمول پر آ گئے، تب ہی ان لوگوں کو جانے دیا۔

واہی صاحب کو مذہبیات سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی، وہ کسی مذہبی تقریب میں شریک بھی نہیں ہوتے تھے، مذہبی اشخاص سے ان کے مراسم ضرور تھے، کئی شیعہ عالم و مجتہد ان کے گھر آتے اور قیام بھی کرتے تھے، وہ ان کی تواضع کرتے، ان کی باتیں سنتے؛ مگر ہمیشہ بحث و مباحثے سے گریز کرتے تھے۔ انہوں نے تمام موضوعات پر نظمیں کہیں؛ لیکن کسی مذہبی موضوع پر نظم لکھنے میں دلچسپی نہیں لی۔ واہی تمام مذاہب کا دل سے احترام کرتے تھے، ان کا عقیدہ مذہب انسانیت تھا، وہ اعلیٰ انسانی اقدار

کے پیروکار رہے۔ان کے صاحبزادے سید علی رضا نقوی کا بیان ہے کہ:

''آپ نے ہمیشہ اعلیٰ انسانی اقدار پر بھروسہ کرتے ہوئے انسانیت کے سنہرے احساس کو مذہب پر مقدم جانا۔بدترین فسادات کے دوران بھی آپ کے پایۂ استقلال میں جنبش نہیں ہوئی''۔

(ایضاً،ص:۱۱۰)

لیکن اس نفرت کی سیاست کے نتیجے میں ملک کی تقسیم کا المیہ سامنے آیا۔صرف ملک ہی تقسیم نہیں ہوا؛ بلکہ خاندان اور احباب بھی تقسیم ہوئے۔رضا نقوی کے متعدد رشتے دار پاکستان کو ہجرت کیے،کتنے ہی دوست واحباب وہاں منتقل ہوئے اور انہیں بھی پاکستان آنے کی دعوت دے گئے۔بہتر زندگی اور سنہرے مستقبل کی آرزو،نیز اردو زبان کی ترقی کے خیال سے واہیؔ بھی پاکستان سدھارے؛مگر اس مملکت اسلامی میں ان کا دل نہیں لگا،حالاں کہ انہیں وہاں کی قومی اسمبلی میں باوقار ملازمت بھی مل گئی تھی۔واہیؔ پاکستان سے الٹے پاؤں واپس چلے آئے۔اس ضمن میں ان کے صاحبزادے علی رضا نقوی بتاتے ہیں:

''دو وجوہات کی بنا پر آپ نے وہاں کی رہائش کا ارادہ ترک کیا۔ایک تو عزیز واقارب کی بے اعتنائی اور سرد مہری،حالاں کہ شروع کے دنوں میں وہی لوگ خوب خاطر مدارات کرتے رہے؛لیکن جیسے ہی انہیں یہ احساس ہونے لگا کہ آپ مستقل قدم جمانے کی سوچ رہے ہیں،ان کے رویہ میں تبدیلی آنے لگی۔اگلی گرم جوشی کافور ہونے لگی۔ظاہر ہے کہ آپ جیسے حساس انسان کی طبع نازک پر تازیانہ لگا ہوگا۔دوسرا وہ واقعہ جب بس میں سفر کرتے ہوئے آپ کے ہم سفر کو کنڈکٹر نے چند پیسوں کی خاطر اٹھا کر باہر پھینک دیا۔وہ مظلوم بھی مسلمان مہاجر تھا''۔

(''رضا نقوی واہیؔ: آئینہ در آئینہ''ص:۱۱۰-۱۱۱)

ظاہر ہے واہیؔ کے حساس دل کو اس سے زبردست چوٹ لگی ہوگی؛اسی لیے انہوں نے وطن واپسی کا فیصلہ لیا اور پھر کبھی ادھر مڑ کر بھی نہیں دیکھا،یہاں تک کہ وہاں سے آئے کسی مشاعرے،یا ادبی تقریب کی دعوت بھی قبول نہیں کی۔اس کا ایک سبب تو یہ تھا کہ رضا نقوی اعلیٰ انسانی قدروں پر بھروسہ کرتے تھے اور انسانیت کے زریں اصولوں کو مذہب پر مقدم مانتے تھے؛اس لیے جب وہاں انہوں نے انسانیت کی ایسی ناقدری دیکھی تو ان کا ذہن منتشر ہوگیا اور وہ اپنے وطن کو واپس آنے کے

لیے بے تاب ہوگئے۔اپنی سرزمین پر ان کی شخصیت ہر مذہب،مسلک،عقیدے اور حلقے کے لوگوں میں محترم رہی اور انہیں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا گیا۔واہیؔ کے ایک پڑوسی اور دفتر میں تقریباً تیس سالوں تک ان کے شریک کار رہے ریٹائرڈ ڈپٹی سکریٹری دھیریندر پرساد کی رائے ہے کہ:

''اب ایسے لوگ کہاں پیدا ہوتے ہیں،رضا صاحب ہیرا تھے ہیرا،ہم لوگوں کا ساتھ تین دہائیوں تک رہا،نہ صرف دفتر میں؛ بلکہ گھر پر بھی،ہم سب ایک دوسرے کے گھر کے فرد کی طرح تھے۔سب ایک دوسرے کے دکھ درد میں،غم اور خوشی میں ایک طرح سے شریک تھے،کسی قسم کی غیریت تھی ہی نہیں۔رضا صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ کسی کی بھی پریشانی کے بارے میں سن کر خود وہ پریشان ہو جاتے تھے اور اس کے تدارک کے لیے تگ ودو شروع کر دیتے تھے،کتنے ہی اصحاب کو انہوں نے تعلیم حاصل کرنے میں مدد دی اور کوشش کر کے ملازمت میں رکھوا دیا۔ان کی خدمت قطعی بے لوث ہوتی تھی،کسی سے بھی کسی قسم کی خدمت کے روادار نہیں تھے،یہاں تک کہ پیرانہ سالی میں بھی کسی کی خدمت نہیں لی اور چلتے پھرتے رخصت ہوگئے''۔

واہیؔ کی صحبت میں بیٹھنے والے احباب ومعاصرین نے ان کی وسیع القلبی،فراخ دلی اور رواداری کی ستائش کی ہے؛لیکن جہاں تک طنز وظرافت کا سوال ہے تو واہیؔ اس میں کسی کو بھی نہیں بخشتے تھے،اپنے آپ کو بھی نہیں۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے پروگرام لکھ کر خود کا بھی مذاق اڑایا۔مشاعروں میں شاعروں کی کیا درگت بنتی ہے،اس ضمن میں ''مشاعرہ سے پہلے'' اور ''مشاعرہ کے بعد'' لکھ کر اپنا ہی خاکہ اڑایا۔اردو کی کتابیں نہیں بکتی ہیں تو نظم ''لے دہی'' لکھ کر اپنے اوپر ہی طنز کیا اور انتہا تو یہ کر دیا کہ خود ہی اپنے انتقال پر نظم لکھ دی۔پاکستان کے ایک رسالے میں جب یہ نظم چھپی تو وہاں کے ادبا وشعرا نے یہ سمجھا کہ واقعی رضا نقوی واہیؔ کا انتقال ہوگیا ہے،لہٰذا وہاں کے کثیر الاشاعت اخبارات میں بھی ان کی رحلت کی خبر تعزیتی نوٹ کے ساتھ شائع ہوگئی اور پھر واہیؔ کے گھر پر تعزیتی خطوط کی آمد کا سلسلہ شروع ہوگیا اور مزے کی بات تو یہ ہوئی کہ خود واہیؔ نے فرداً فرداً جواب تحریر کیا،وہ ہر آنے جانے والے کو یہ خطوط دکھاتے اور انہیں چٹخارے لے لے کر سناتے بھی تھے،پھر یہ بھی فرماتے کہ ان تمام تعزیتی خطوط کا جواب میں خود ہی دے رہا ہوں،اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے تھے کہ موت سے قبل انتقال کی خبر شائع ہو جانے سے زندگی طویل ہو جاتی ہے اور واقعی اس نظم کی اشاعت کے بعد وہ مزید دس سالوں تک زندہ رہے۔

رضا نقوی واہی نے ۱۹۲۸ء میں شعر کہنا شروع کیا۔ شروع میں غزل، نوحے، سلام اور قصیدے لکھے۔ شاعری کے ابتدائی دور میں واہی جوش ملیح آبادی سے بہت متاثر ہوئے۔ جوش کے اندازِ فکر و بیان کو ان کے ذہن نے قبول کیا اور انہوں نے بہت سی سنجیدہ نظمیں ان کی طرز پر لکھیں۔ مثلاً ''مانجھی''، ''بھوک''، ''مشعل''، ''آج کچھ کھایا نہیں''، ''اچھوت'' وغیرہ جو اس زمانے کے معروف رسائل ''نگار''، ''ساقی''، ''ادب لطیف'' اور ''ایشیا'' وغیرہ کی زینت بنیں۔ جوش کے علاوہ واہی میر انیس کے کلام سے بھی متاثر رہے۔ ۱۹۵۰ء کے آس پاس طنز و مزاح کی طرف مائل ہوئے اور پھر یہی ان کا مستقل میدان بن گیا۔ طنز و مزاح کے فروغ کے لیے بھی واہی نے مخلصانہ کوششیں کیں۔ ۱۹۷۶ء میں ظریفانہ ادب کے فروغ و استحکام کے لیے ''کل ہند جشن ظرافت کمیٹی'' کی بنیاد ڈالی۔ ۱۱/ اور ۱۲/ دسمبر ۱۹۷۶ء کو پٹنہ میں عظیم الشان ''جشن ظرافت'' کا انعقاد کیا، جس میں ہند و پاک کے کئی اہم مزاح نگاروں نے شرکت کی۔ یہ دو روزہ جشن ظرافت بے حد کامیاب رہا، اس کے بعد دوسرے جشن ظرافت کا انعقاد ۱۹۸۰ء میں اور تیسرے جشن ظرافت کا انعقاد ۱۹۸۳ء میں ہوا۔ تینوں جشن میں کل ہند مزاحیہ مشاعرہ بھی منعقد ہوا، اس کے ذریعہ رضا نقوی واہی نے ظریفانہ ادب کو قبول عام بنانے کی سعی کی اور اس میں انہیں کامیابی بھی نصیب ہوئی۔

واہی نے ظرافت کی دنیا میں اپنی ایک مخصوص پہچان بنائی۔ ان کے مجموعہ ہائے کلام ''واہیات''، ''طنز و تبسم''، ''نشتر و مرہم''، ''کلام نرم و نازک''، ''نام بہ نام''، ''متاع واہی''، ''شعرستان واہی'' اور ''منظومات واہی'' ان کی زندگی میں ہی شائع ہو کر مقبول خاص و عام ہوئے۔ ''باقیات واہی'' ۲۰۰۴ء میں بعد از مرگ طبع ہوا۔ ہندی زبان میں بھی دو مجموعۂ کلام ''چٹ پٹی نظمیں'' اور ''ترکش واہی'' اور ایک نثری کتاب ''اردو شاعری اور بہار'' شائع ہو چکی ہیں۔

واہی ایک قادر الکلام شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک صاحب طرز نثر نگار بھی تھے۔ روز نامہ ''ساتھی''، پٹنہ میں وہ برسوں مزاحیہ نظمیں اور کالم لکھتے رہے۔ وقتاً فوقتاً انہوں نے تنقیدی مضامین بھی لکھے، جو مختلف رسائل و جرائد میں اشاعت پذیر ہو چکے ہیں۔ ان کے ادبی مقالات کی تعداد دو درجن سے زائد ہے، جو آج تک مختلف رسالوں میں بکھرے پڑے ہیں۔ انہوں نے درجنوں کتابوں پر تبصرے بھی کیے۔ راقم نے متعدد کتابوں میں ان کے مقدمے، دیباچے اور تنقیدی شذرات بھی پڑھے ہیں۔ اس کے علاوہ ترتیب و تدوین کے سلسلے میں ان کی جو خدمات رہی ہیں، اسے بھی فراموش

نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے ۱۹۴۴ء میں زبیر احمد تمنائی کے اشتراک سے بہار کے نظم گو شعرا پر مشتمل ایک انتھولوجی ''اشارہ'' کے عنوان سے ترتیب دے کر شائع کی تھی۔ ۱۹۵۲ء میں ''اشارہ'' کی دوسری جلد بھی ترتیب دے کر شائع کی۔ ۱۹۵۳ء میں علامہ جمیل مظہری کی نظموں کا مجموعہ ''نقش جمیل'' ترتیب دے کر شائع کیا اور ۱۹۵۷ء میں ان کی غزلوں کا مجموعہ ''فکر جمیل'' مرتب کر کے منصۂ شہود پر لایا۔ علامہ جمیل مظہری کی تخلیقات کو محفوظ کرنے میں واہی صاحب کا جو رول رہا ہے، اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر شہناز فاطمی نے جمیل مظہری اور واہی صاحب کے رشتے کی وضاحت کرتے ہوئے بالکل درست لکھا ہے کہ:

> ''جمیل مظہری صاحب سگریٹ بہت ہی زیادہ پیتے تھے اور ہر طرح کی سگریٹ پیتے تھے۔ وہ واہی صاحب کے یہاں اکثر ہی مہینہ دو مہینہ اور کبھی کبھی تو سال بھر بھی رہ لیتے تھے؛ کیوں کہ اس گھر کو وہ اپنا ہی مانتے تھے اور یہاں کے رہنے والے بھی سبھی لوگ انہیں اپنے والد (واہی صاحب) کی طرح ہی عزیز رکھتے تھے۔ ان کی ایک عادت تھی، وہ یہ کہ وہ کسی بھی کاغذ کے ٹکڑے کا استعمال اپنے اشعار کو لکھنے کے لیے کر لیا کرتے تھے، چاہے وہ سگریٹ کا کاغذ ہی کیوں نہ ہو۔ ابا کا ان دنوں یہ مشغلہ ہوا کرتا تھا کہ وہ جمیل صاحب کے لکھے ہوئے ٹکڑوں کو ایک پیکٹ میں جمع کر لیا کرتے تھے، جو کئی سالوں کے بعد اچھے خاصے ذخیرہ کی شکل میں ہو گیا تھا، جنہیں جمع کر کے واہی صاحب نے ہی کتاب کی شکل میں پہلی مرتبہ چھپوانے کا کام کیا۔ اس میں ان کی اور ان کے بچوں کی کتنی محنت لگی ہوگی، اسے آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ہاں اس کے لیے انہوں نے اپنی رفیقۂ حیات کے کچھ زیور بھی گروی رکھ دئے تھے۔ اس سے بڑا دوستوں کا سچا دوست ہونے کی کوئی دوسری مثال میری سمجھ میں تو نہیں نظر آتی ہے''۔

(یادگاری مجلّہ ''جشن واہی''، ٹی پی ایس کالج، پٹنہ)

واہی صاحب اپنے کچھ نوجوان دوستوں کے ساتھ پروفیسر اختر اورینوی کی شخصیت اور فن پر ایک رسالے کا نمبر نکالنے میں بھی سرگرم عمل رہے۔ تقریباً چھ سو صفحات پر محیط یہ خاص نمبر ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا تھا۔

واہی نے ریڈیو، ٹی وی کے لیے متعدد فیچر اور مضامین لکھے۔ ملک کے مختلف شہروں میں

سینکڑوں مشاعرے پڑھے۔ ان کی خدمات جتنی وقیع رہی ہیں، اس اعتبار سے ان کی پذیرائی نہیں ہوسکی۔ بہرطور بہار، اتر پردیش اور مغربی بنگال کی اردو اکیڈمیوں نے ان کی بعض کتابوں پر انعامات ضرور دیے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ، دہلی کی جانب سے ۱۹۸۵ء اور ۱۹۸۷ء میں ان کے طنز ومزاح کی گراں مایہ خدمات اور ظریفانہ شاعری کے لیے غالب ایوارڈ دیا گیا اور پھر ۱۹۹۹ء کے ماہ جون میں حکومت بہار کے محکمۂ راجبھاشا نے ان کی مجموعی خدمات کے اعتراف میں پروقار ''مولانا مظہرالحق شکھر سمان'' عطا کیا۔

پٹنہ کے بعض دوست واحباب کو ''جشن واہی'' منانے کا خیال آیا۔ شہر کی ایک انجمن ''اعتراف'' نے اس جشن کا اہتمام کیا۔ ''جشن واہی'' کا انعقاد ۱۱ر اکتوبر ۱۹۹۸ء کو پٹنہ میں ہوا، جس کا افتتاح پٹنہ ہائی کورٹ کے جج جسٹس آفتاب عالم کے ہاتھوں ہوا۔ اس موقع پر واہؔی کے فکر وفن سے متعلق کئی مقالے پڑھے گئے۔ ممتاز جدید نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے واہؔی کے فن کا موازنہ بعض مغربی طنز ومزاح نگاروں سے کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ واہی کے یہاں زیادہ تنوع ہے، زیادہ موضوعات ہیں؛ اس لیے ان کا پلہ مغرب کی طنزیہ ومزاحیہ شاعری سے بلند ہے۔ ۱۶، ۱۷ر دسمبر ۲۰۱۷ء کو شعبۂ اردو، ٹی پی ایس کالج، پٹنہ نے صد سالہ جشن واہی کا اہتمام کرتے ہوئے ''رضا نقوی واہی: حیات وخدمات'' کے عنوان سے دو روزہ قومی سیمینار اور طنزیہ ومزاحیہ مشاعرے کا انعقاد کیا۔

واہؔی کی کئی نظمیں مختلف صوبوں کے سیکنڈری، ثانوی سیکنڈری اور یونیورسٹیوں کے گریجویشن اور ماسٹر ڈگری کے نصابات میں شامل رہیں اور بعض جگہوں پر آج بھی ہیں۔ ان کے فکر وفن پر کئی یونیورسٹیوں میں تحقیقی مقالے لکھے گئے۔ ۱۹۸۵ء میں رانچی یونیورسٹی سے ڈاکٹر عقیل اشرف نے ''رضا نقوی واہی کی مزاحیہ شاعری کا تنقیدی مطالعہ'' کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھ کر پی ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی۔ مشتاق احمد مشتاق کے تحقیقی مقالہ ''جدید اردو شاعری میں طنز ومزاح کی روایت اور رضا نقوی واہی کی شاعری'' پر بی آر امبیڈکر بہار یونیورسٹی، مظفر پور نے انہیں پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی۔ بھوپال میں شفیقہ فرحت کی نگرانی میں جاوید اختر نے واہؔی کی ظریفانہ شاعری پر تحقیقی مقالہ قلم بند کیا۔ ان کے علاوہ بعض دوسری یونیورسٹیوں میں ایم۔ فل اور پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے لکھے گئے تحقیقی مقالات میں واہؔی کی شاعری کو موضوع بنایا گیا ہے۔

رسالہ ''ادب نکھار'' مئو ناتھ بھنجن، اتر پردیش نے ۱۹۸۳ء میں رضا نقوی واہؔی کی شخصیت

اور کارنامے پر ایک ضخیم نمبر شائع کیا تھا۔ ۲۰۰۳ء میں ''کتابی دنیا'' دہلی کے زیر اہتمام راقم الحروف کی مرتبہ ضخیم کتاب ''رضا نقوی واہی: آئینہ در آئینہ'' کے نام سے شائع ہوئی۔ واہی کی شخصیت اور شاعری پر یہ پہلی کتاب ہے، جو آج بھی رضا نقوی واہؔی کی شخصیت اور شاعری کو سمجھنے میں بے حد معاون ہے۔ ادبی حلقے میں اس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ رسالہ ماہنامہ ''اردو دنیا'' دہلی نے مئی ۲۰۱۵ء کے شمارہ میں واہی کی شخصیت اور فن پر ایک خصوصی گوشہ شامل کیا تھا۔

۵ر جنوری ۲۰۰۲ء کو ڈیڑھ بجے دن میں خادم زبان وادب، تاجدار طنز وظرافت، شہنشاہ خلوص ومحبت رضا نقوی واہؔی ۸۸ر سال کی عمر گزار کر راہی ملک عدم ہوئے۔ شیعہ قبرستان، افضل پور، پٹنہ میں تدفین عمل میں آئی۔

❁

سنجیدہ شاعری

رضا نقوی نے طالب علمی کے زمانے میں ۱۹۲۸ء کے آس پاس شاعری شروع کر دی تھی۔ کم عمری میں ہی ان کے دل و دماغ میں شاعرانہ خیالات انگڑائیاں لینے لگے، جسے وہ شعری لباس عطا کرنے میں منہمک ہو گئے۔ ابتدا میں عین الہدیٰ ثمرؔ سے اصلاح لی۔ انہوں نے ہی شاعری کے رموز ونکات سے آگاہ کیا۔ بعد ازاں پروفیسر عبدالمنان بیدلؔ کے آگے اصلاحِ سخن کے لیے زانوئے ادب تہہ کیا۔ رضا نقوی ابتدائی دور میں سنجیدہ شاعری کرتے تھے۔ ان دنوں وہ رضا نقوی کے نام سے لکھتے تھے، کوئی تخلص اختیار نہیں کیا تھا۔ موصوف ایک تہذیبی بستی اور ذی علم گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، جہاں شعری وادبی نشستوں اور مجلسوں کا سلسلہ رہتا، اسی ماحول وفضا میں انہوں نے آنکھیں کھولیں اور بچپن میں ہی نوحہ وسلام اور قصائد وغیرہ کہنے لگے۔ پروفیسر عبدالمنان نے انہیں غزل گوئی کی طرف مائل کیا۔ ان کی ابتدائی غزل کے دوشعر ملاحظہ فرمائیں۔

خم محراب کعبہ میں ترا ابرو جھلکتا ہے
نظر جس چیز پر پڑتی ہے اس میں تو جھلکتا ہے
پسینہ موت کا آیا کسی بے بس کے ماتھے پر
ندامت کا کسی کی آنکھ میں آنسو جھلکتا ہے

پٹنہ کالج میں طالب علمی کے دوران ان کی شاعری پروان چڑھی۔ پروفیسر حافظ عبدالمنان

بیدلؔ، پروفیسر حافظ شمس الدین شمسؔ منیری، علامہ وحشتؔ کلکتوی، علامہ جمیل مظہری، اجتبیٰ رضوی، پرویز شاہدی، عباس علی خاں بیخودؔ عظیم آبادی، ل۔احمد اکبر آبادی جیسی مایہ ناز شخصیات کی صحبتوں اور اختر اورینوی، زبیر احمد تمنائی، شرف الدین احمد شرفؔ عظیم آبادی، یحییٰ نقوی، نادم بلخی اور سلطان احمد بہزاد فاطمی جیسے مخلص دوست واحباب سے ادبی موضوعات پر گفت وشنید نے بہت اہم رول ادا کیا، جس کے باعث وہ بھی ادبی شاہراہ پر چل نکلے۔ ''بزم ادب'' پٹنہ کالج اور ''بزم سخن'' سائنس کالج کے زیر اہتمام اکثر شعری نشستوں اور مشاعروں کا انعقاد ہوتا، جس میں رضا نقوی بھی شریک ہونے لگے۔ ۱۹۳۲ء میں انہوں نے ''بزم ادب'' کے سالانہ مشاعرے میں اپنی غزل پیش کر کے باضابطہ مشاعرہ پڑھنے کا آغاز کیا، انہوں نے اس موقع پر جو غزل پڑھی وہ نہ صرف پسند کی گئی؛ بلکہ بعض اشعار کو احباب وسامعین نے خوب سراہا، جس سے ان کے حوصلے کو توانائی، اعتماد کو پختگی اور شاعرانہ شعور کو سمت ورفتار ملی۔ اس غزل کے دو اشعار پیش ہیں۔

کانٹو بجھا لو پیاس کہ راہ دراز سے
آیا ہوں جام آبلۂ پا لیے ہوئے
آیا تھا لے کے عالم امید دہر میں
اب جا رہا ہوں یاس کی دنیا لیے ہوئے

ان کی یہ غزل معروف رسالہ ''ندیم'' گیا میں اشاعت پذیر ہوئی، جس سے ان کی ہمت افزائی ہوئی، جس زمانے میں رضا نقوی نے شعور کی آنکھ کھولی، اس وقت ترقی پسند تحریک اپنے پورے شباب پر تھی، اس تحریک سے رضا نقوی بھی متاثر ہوئے۔ اس دور میں جوشؔ ملیح آبادی کی شاعری کی خوب دھوم مچی تھی، ان کے یہاں الفاظ کے در و بست کا جو حسن تھا اور جو گھن گرج تھی، اس سے رضا نقوی بے حد متاثر ہوئے، اس امر کا اعتراف خود رضا نقوی نے بھی کیا ہے۔ اس کے علاوہ ''بھوک''، ''مشعل''، ''آج کچھ کھایا نہیں''، ''اچھوت''، ''مانجھی''، ''نوجوانوں کا کورس''، ''کسان کا گیت'' اور ''چلنا تیرا کام ہے راہی''، جیسی نظموں کے طرز وتیور سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ جوشؔ کے افکار اور طرز سخن سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔ رضا نقوی کی یہ نظمیں اس زمانے کے مقتدر رسائل ''نگار''، ''ساقی''، ''ادب لطیف''، ''ایشیا'' اور ''ندیم'' وغیرہ میں شائع ہوئی تھیں۔ رضا نقوی، جوشؔ کے علاوہ میر انیسؔ کی شاعری سے بھی شدید طور پر متاثر تھے۔ اس امر کا اعتراف وہ، یوں کرتے ہیں:

''جوش کے علاوہ میر انیس کے کلام سے بے حد متاثر ہوتا رہا؛ اس لیے کہ میں جس بستی کا رہنے والا ہوں، یا تھا، وہاں پر ایام محرم میں مجلسیں ہوا کرتی تھیں۔ انیسؔ کے مرثیے پڑھے جاتے تھے، جن سے میرا ذہن متاثر ہوتا تھا''۔

(''ادب نکھار'' مئو ناتھ بھنجن، رضا نقوی واہی نمبر، ص: ۱۸)

رضا نقوی نے اس زمانے میں روایت کے مطابق غزلیں اور نظمیں لکھیں، انہوں نے راقم الحروف سے ایک مکالمہ کے دوران، ایک سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ ان کی پہلی نظم ''آج کچھ کھایا نہیں'' ہے، جو اس عہد کے معروف رسالہ ''ادب لطیف'' میں شائع ہوئی تھی۔ اس ضمن میں خود ان کا بیان ہے کہ:

''غالباً پہلی نظم 'آج کچھ کھایا نہیں' کے عنوان سے رسالہ 'ادب لطیف' لاہور میں شائع ہوئی، اس زمانے میں ترقی پسند تحریک شباب پر تھی اور نظم بھی کچھ اسی مناسبت سے تھی؛ اس لیے شائع بھی ہوئی اور سراہی بھی گئی، پھر تو لکھنے اور چھپنے کا سلسلہ مسلسل رہا''۔

(''رضا نقوی واہی: آئینہ در آئینہ'' مرتبہ: ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ص: ۱۳۷)

رضا نقوی کی سنجیدہ اور ترقی پسند شاعری کا سلسلہ تقریباً ۱۹۴۸ء تک جاری رہا۔ اس دوران انہوں نے متعدد نظمیں اور غزلیں کہیں، کچھ مقامی اور کچھ بیرونی مشاعروں میں پڑھیں اور کچھ شائع بھی کروائیں؛ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انہوں نے اپنی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے سامنے سنجیدہ و انقلابی نظموں اور غزلوں کو کبھی درخور اعتنا نہیں سمجھا۔ بہت ہی خوشی کی بات ہے کہ ان کے صاحبزادے سید جعفر رضا نقوی اور ان کی اہلیہ ڈاکٹر شہناز فاطمی نے ان کی سنجیدہ شاعری کا وافر حصہ ''باقیات واہی'' میں شامل کر لیا ہے۔ یہ کتاب ۲۰۰۴ء میں گنگا جمنا پرکاشن، پٹنہ کے زیر اہتمام شائع ہوئی ہے۔ اس میں نعت، منقبت، قصائد اور سلام کے علاوہ ۴۰ رنظمیں، ۱۵ رغزلیں اور متفرقات کے تحت وداعیہ، تہنیت نامہ، سہرے، منظوم خطوط، قطعات، فردیات اور چند نثری تحریریں شامل ہیں۔ ابتدا میں مرتبین نے بہزاد فاطمی کی ایک پرانی تحریر ''واہی کی کہانی، میری زبانی'' مشمولہ ''رضا نقوی واہی: آئینہ در آئینہ'' کو ''ایسا کہاں سے لائیں کہ۔۔۔'' کے عنوان کے تحت شامل کر لیا ہے۔ ڈاکٹر شاہد جمیل نے مختصر اور جامع مقدمہ تحریر کیا ہے۔ ''عرض مرتب'' میں ڈاکٹر شہناز فاطمی نے انتخاب و ترتیب کی روداد قلم بند کی ہے۔

رضا نقوی کی ابتدائی نظموں ''آج کچھ کھایا نہیں''، ''چلنا تیرا کام ہے راہی''، ''بھوک''،

''اچھوت''، ''نوجوانوں کا کورس''، ''منزل انسان''، ''مانجھی''، ''کسان کا گیت''، ''مشعل''، ''آزادی''، ''غلط فہمی''، ''ہم''، ''آدم کا سفر''، ''یوم جمہوریہ'' وغیرہ میں زمانے کی ابتلا اور درد بھری زندگی کے الائم و مصائب کے ساتھ آزادی سے قبل کے مختلف النوع مسائل و صورت حال کی نقش گری ملتی ہیں۔ ترقی پسندی سے متاثر ان نظموں میں جبر و استحصال کے شکار مظلوموں اور غریبوں کے جذبات منعکس ہوئے ہیں۔ ان میں ظلم و ستم کے خلاف انقلاب برپا کر دینے والی کیفیت موجود ہے۔ ان کا انقلابی تیور جوش ملیح آبادی کے آہنگ و تیور سے کم نہیں ہے۔ عام انقلابی شعرا کی طرح ان کے یہاں فقط گھن گرج، للکار اور نعرے بازی نہیں؛ بلکہ فنی امور و نکات اور صناعی بھی ملتی ہے۔ آزادی سے قبل کی نظمیں معاشرے میں انقلابی فکر کو راہ دینے میں اس قدر موثر ثابت ہوئیں کہ اس زمانے کی ضبط شدہ نظموں میں، ان کی نظم ''مانجھی'' کو بھی شامل کیا گیا؛ کیوں کہ یہ نظم تحریک آزادی کے دوران لکھی گئی تھی اور جیلوں میں کورس کے انداز میں گائی جاتی تھی۔ اس نظم کے دو بند ملاحظہ ہوں:

بادل بھی گرجتے ہیں مانجھی، بجلی بھی چمکتی ہے مانجھی
دائیں بائیں سناٹا ہے اور رات اندھیری ہے مانجھی
بجھتا ہے من کا دیا مانجھی
ہاں کشتی تیز چلا مانجھی

اس پار ہمیں لے چل مانجھی فطرت کو جہاں آزادی ہے
کہتے ہیں جسے جلووں کا وطن جلووں کی جہاں آزادی ہے
رہتی ہے جہاں رادھا مانجھی
ہاں کشتی تیز چلا مانجھی

۱۹۳۶ء کے بعد جب ادب میں زندگی کی حقیقت پسندانہ تصویر کشی کا تصور عام ہوا اور نئی نسل کے ادبا و شعرا اس تحریک کو لبیک کہتے ہوئے جوق در جوق آگے بڑھے تو رضا نقوی کے لاشعوری ذہن نے بھی ترقی پسند تحریک اور اس کے اغراض و مقاصد کو قبول کرنے میں کوتاہی نہیں برتی، حالاں کہ حالی کے زمانے سے ہی اس تحریک کی فضا ہموار ہونا شروع ہو گئی تھی؛ لیکن بیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے جب اس تحریک نے زور پکڑا تو وہ زمانہ رضا نقوی کے عنفوان شباب کا زمانہ تھا۔ اس وقت تک رضا نقوی جدید ترین نسل کے متحرک اور نوجوان شاعروں میں بعض فنی اور شعری اختصاص کے سبب اپنی

پہچان بنا چکے تھے، چوں کہ ترقی پسند ادبی تحریک کا منشور عام زندگی میں خوشحالی اور ترقی بحال کرنا تھی اور مزدوروں و کسانوں کے مسائل کا بھی سد باب کرنا تھا؛ اس لیے یہ تحریک بہت مضبوطی کے ساتھ آگے بڑھی اور تعمیرات زندگی کی خاطر اس کے بہت موثر اور مثبت نتائج سامنے آئے؛ اسی لیے اسے اشتراکی تحریک سے بھی موسوم کیا گیا، چوں کہ زمانے کے تمام حالات و حادثات اور زندگی کے روح فرسا مناظر کو رضا نقوی کی متجسس نگاہیں بھی دیکھ رہی تھیں، تحریک کے اغراض و مقاصد پر بھی ان کی خاص نگاہ تھی؛ اس لیے انہوں نے بھی اس تحریک کا احترام کرتے ہوئے خود کو اس سے وابستہ کیا اور مغرب کے نظریہ سے پیدا ہوئے عوامی مسائل سے متاثر ہو کر مغربی سیاسی پالیسی کے پیش نظر افراد کے ذہنوں کو بیدار کرنے اور سماجی زندگی میں تبدیلی لانے کی غرض سے انقلابی شاعری کو گلے سے لگایا اور ''بھوک''، ''مشعل''، ''آج کچھ کھایا نہیں''، ''اچھوت''، ''مانجھی''، ''نوجوانوں کا کورس''، ''کسان کا گیت'' اور ''چلنا تیرا کام ہے راہی'' جیسی انقلابی نظمیں لکھیں، جو انہیں ترقی پسند شعرا کی صف میں کھڑا کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ان کی پہلی نظم ''آج کچھ کھایا نہیں'' کے چند اشعار دیکھئے:

تازگی سے روح کی کلفت بدلنے کے لیے — جا رہا تھا شام کو کل میں ٹہلنے کے لیے
جانفزا برسات، باد سرد اٹھلائی ہوئی — ہر طرف منظر پہ تھی رومانیت چھائی ہوئی
ہوٹلوں میں ہر طرف اک شور نائے نوش تھا — کوئی نو وارد کوئی رخت سفر بر دوش تھا
الغرض ہر شئے میں تھی اک دلکشی اک زندگی — اور زمیں سے آسماں تک تازگی ہی تازگی
ناگہاں اک ناتواں مزدور آیا سامنے — دعوتیں دی تھیں جسے افلاس کے پیغام نے
ملگجی دھوتی کمر میں، تن برہنہ تا کمر — کہہ رہے تھے اس کی حالت کا فسانہ سر بسر
ہو رہا تھا زرد چہرے سے عیاں رنگ ملال — ڈگمگاتے تھے قدم، تھا ناتوانی کا یہ حال
سر پہ خالی ٹوکرا جیسے گرسنہ کا شکم — پشت و گردن میں کجی یوں جیسے بدبختی کا خم
دفعتہً جھجکا، رکا اور تلملا کر گر پڑا — ٹوکرا ہاتھوں سے چھوٹا، دور جا کر گر پڑا
سر میں چوٹ آئی لہو زخموں سے جاری ہو گیا — یک بیک عالم غشی کا اس پہ طاری ہو گیا
ایک تماشہ بن گیا، دو چار بے فکرے بڑھے — حال پہ اس کے خیال آرائیاں کرنے لگے
کوئی کہتا تھا 'ہے شاید اس پہ مرگی کا اثر' — کوئی کہتا تھا 'اسے شاید کم آتا ہے نظر'
کوئی یہ کہنے لگا 'ہے یہ شرابی کی سزا' — مل گیا حد سے سوا پینے کا بالآخر مزا

چند لمحوں تک وہ بے ہوشی کے عالم میں رہا — رفتہ رفتہ پھر ہوئے ہوش و حواس اس کے بجا
'یہ ہوا کیا؟' ایک نے پوچھا جو بیٹھا تھا قریں — وہ نقاہت سے یہ بولا 'آج کچھ کھایا نہیں'

رضا نقوی کی شاعری میں ترقی پسندی کے لوازم تو ملتے ہیں؛ لیکن یہ شور و غوغا، گھن گرج، جوش و ولولہ، للکار و پکار، آہ و فغاں اور نعرے بازی سے پاک ہے۔ وہ مظلوموں و مزدوروں پر ہونے والے ظلم و جبر اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں، ان کی حمایت و ہمدردی کی باتیں کرتے ہیں؛ لیکن نرم روی کے ساتھ ترقی پسند تحریک کے فروغ و استحکام میں بھی واہی سرگرم عمل رہے۔ بقول نادم بلخی:

''انجمن ترقی پسند مصنفین، بہار کو واہی صاحب اور سہیل عظیم آبادی کی بھرپور حمایت حاصل تھی، یہ لوگ اس کے جلسوں میں بھی کبھی کبھی شریک ہوتے تھے۔ واہی صاحب نے سارے ترقی پسند نوجوان فنکاروں کی ہمت افزائی کی، جس کے نتیجے میں انجمن کی شاخ، صوبۂ بہار کے کئی شہروں، مثلاً رانچی، جمشید پور، دربھنگہ، بہار شریف، سمستی پور وغیرہ میں قائم ہوئی۔ پٹنہ کی شاخ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ انجمن کا ایک ہفتہ وار ''گشتیہ'' شائع ہونے لگا۔ انجمن کی طرف سے ایک رسالے کا بھی اجرا ہوا، جس کا نام ''نئی راہ'' رکھا گیا، اس کے مدیر حسن نعیم تھے۔ ''نئی راہ'' کے ایک یا دو شمارے ہی چھپ سکے تھے۔ ''گشتیہ'' اور ''نئی راہ'' کا وہی حشر ہوا جو عام طور پر اردو کے اخبار و رسالے کا ہوتا ہے۔ لیکن ادریس سنسہاروی مرحوم گیا سے پٹنہ آ کر محلہ شاہ گنج میں اپنی فیملی کے ساتھ ایک کرائے کے مکان میں رہنے لگے۔ اسی مکان کے ایک گوشے میں ہفتہ وار ''زمین'' کا دفتر بنایا گیا، جس کے مدیروں میں ڈاکٹر شکیل الرحمٰن اور نادم بلخی تھے۔ اس کا اجرا ۱۹۵۲ء میں ہوا اور تقریباً ایک سال سے زیادہ عرصے تک یہ باقاعدگی سے نکلتا رہا۔ واہی صاحب اس کے دفتر میں تشریف لا کر ہم لوگوں کی ہمت افزائی کرتے رہے۔''

(''رضا نقوی واہی: آئینہ در آئینہ'' مرتبہ: ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ص: ۴۲)

رضا نقوی دراصل ان ترقی پسند فنکاروں میں سے نہیں تھے، جو جذباتیت کی رو میں بہہ کر ادب کی جمالیات کو نقصان پہنچا رہے تھے۔

وہ بھوکا ہے وہ ننگا ہے جو پیٹ سبھوں کا بھرتا ہے
انسانوں کی اس بستی میں ابلیس خدائی کرتا ہے

جلتے ہیں چراغ اس بستی میں دہقاں کے خونِ حسرت سے
لیکن خود ان کی دنیائیں معمور ہیں ہر سوں ظلمت میں

رضا نقوی ایک قادرالکلام شاعر ہیں۔ان کی شاعری میں تنوع ہے،وہ اپنی غیر معمولی اختراعی قوت سے اس میں جدت وندرت پیدا کرتے ہیں اور نہایت کامیاب اور موزوں طرز اظہار ایجاد کر لیتے ہیں۔ بلاشبہ ان کی نظمیں عوامی بیداری کا بگل بجاتی ہیں اور خوش آئند مستقبل کی بشارت دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی نظم ''آزادی'' کے یہ اشعار دیکھیے،جس میں خوبصورتی سے ہندوستان کی آزادی کا حاصل جمع پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بھارت کا کر کے بٹوارہ — بھاگا جب انگریز بے چارہ
آزادی کی جئے کار ہوئی — خالص دیسی سرکار ہوئی
نیتاؤں کو سوراج ملا — بھارت کا تخت و تاج ملا
بھوک کی اگنی اور دیوالی — پھول کو ترسے باغ کا مالی

آزادی کے بعد کے حالات وحادثات کے پیشِ نظر ملک میں سماجی،سیاسی اور معاشی سطح پر جو خرابیاں اور بدعنوانیاں پیدا ہوئیں،اس کی طرف واہی نے اپنی بعض نظموں میں بلیغ اشارے کیے ہیں،جو قاری کو چونکاتے ہیں،ان کی غزلیں بھی توجہ طلب ہیں۔ان کے دوست بہزاد فاطمی کا کہنا ہے کہ واہیؔ میں ایک اچھے غزل گو کی تمام خوبیاں موجود تھیں۔ڈاکٹر شاہد جمیل ان کی غزلوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''رضا نقوی کی غزلیں روایت کی پاسدار ہیں،لکیروں پر کھینچی گئی لکیریں نہیں۔دراصل یہ غزلیں بارش کی وہ بوندیں نہیں،جو خاک میں جذب ہو کر خاک میں مل جائیں،یا سمندر میں گر کر بوند سے سمندر بن جائیں؛ بلکہ سواتی کا وہ قطرہ ہیں،جو کھلے منھ سیپ میں گر کر فنا نہیں ہوتیں،گہر بن جاتی ہیں''۔

(''باقیات واہی''ص:۴۱)

مشتے نمونہ از خروارے ان کے چند غزلیہ اشعار درج کیے جاتے ہیں:

زندہ رہنا ہے تو موجوں سے گلے مل کر چلو
زندگی ساحل نہیں ، طوفان کا آغوش ہے

ترے آنسوؤں کی خنکی بھی بجھا سکی نہ اس کو
جو لگی تھی آگ دل میں وہ اسی طرح لگی ہے

بات رکھنی تھی مجھے اہل محبت کی رضاؔ
کچھ نہ پڑھنا مرا توہین محبت ہوتی

حیرت سے دیکھتا ہے مجھے کاروان وقت
جھٹلا رہا ہوں گردش شمس و قمر کو میں
اک جست اور،عزم جواں، وہ ہے آفتاب
قبضے میں کر چکا ہوں بساط قمر کو میں

خم محراب کعبہ میں ترا ابرو جھلکتا ہے
نظر جس چیز پر پڑتی ہے اس میں تو جھلکتا ہے

رضا نقوی نے پسماندہ اور مفلس لوگوں کی زندگی،ان کے دکھ درد،مسائل اور استحصال،نیز ملک کے سیاسی نظام میں در آئی بدعنوانیوں،ناانصافیوں اور تعصب پرستیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے سنجیدہ شاعری کو ترک کر دیا اور زمانے کے حالات سے نبرد آزمائی کے لیے طنز و مزاح کو اپنا مستقل میدان بنالیا۔سچائی تو یہ ہے کہ اگر وہ سنجیدہ شاعری سے ترک تعلق نہیں کرتے تو ترقی پسند شعرا میں یقیناً نمایاں رہتے۔

❋

ظریفانہ شاعری کا آغاز

اردو شاعری میں طنز و مزاح کی روایت قدیم ہے۔ غزلیہ شاعری میں واعظ، ناصح، زاہد اور محتسب کا مذاق اڑایا گیا۔ رقیب، نامہ بر، صیاد اور گل چیں پر طنز کیا گیا۔ جعفر زٹلی پہلا شاعر ہے، جس نے ہجویں، شہر آشوب اور مزاحیہ نظمیں لکھیں۔ جعفر زٹلی کے بعد دہلی اور لکھنؤ کے شعرا میر، سودا، انشا، مصحفی، میر ضاحک، ناجی، کمترین، شاہ حاتم، فغاں، رنگین اور نظیرا کبر آبادی وغیرہ نے ہجو نگاری کی اور شہر آشوب کی صنف کو فروغ دیا؛ لیکن ان کے طنز و مزاح میں وہ شوخی، شگفتگی، برجستگی اور شستہ مزاح کے عناصر نہیں ملتے، جو غالب اور بعد ازاں اکبر الٰہ آبادی، عبدالغفور شہباز، تربھون ناتھ ہجر، ریاض خیر آبادی، احمد علی شوق، ظفر علی خاں وغیرہ کا طرۂ امتیاز ٹھہرا۔ ان لوگوں نے طنزیہ اور مزاحیہ انداز میں فرسودہ رسومات، کٹر مذہبیت، مغربی تہذیب اور بدلتی ہوئی تہذیبی قدروں پر تنقید کی۔ ان کے بعد راجہ مہدی علی خاں، شاد عارفی، ظریف لکھنوی، شوکت تھانوی، نازش کاشمیری، فرقت کاکوروی، مجید لاہوری، انجم مانپوری، احمق پھپھوندوی، مخمور جالندھری، تخلص بھوپالی، شوق بہرائچی، رئیس امروہوی، دلاور فگار، سید ضمیر جعفری اور سید محمد جعفری جیسے شاعروں نے طنز و مزاح کو فروغ دیا۔ اردو میں ایک طویل عرصے تک طنز و مزاح میں عامیانہ انداز، پھوہڑ پن اور سطحیت کی روش قائم رہی، جس کے سبب خالص مزاحیہ ادب کا فقدان رہا۔ بہت کم لوگ اس کے معیار پر کھرے اترتے ہیں۔ اس ضمن میں معروف طنز و مزاح نگار نصرت ظہیر کا یہ بیان مبنی بر حقیقت ہے:

''دنیا کی ہر زبان کے ادب میں طنز و مزاح دیگر اصناف کے مقابلے میں سب سے کم لکھا جاتا ہے۔ اردو اگر چہ دوسری زبانوں کی بہ نسبت مزاح کے معاملے میں انگریزی کی طرح خاصی متمول زبان ہے؛ لیکن اس میں بھی یہ حال ہے کہ ڈھائی من اردو ادب تو لیے، تب کہیں جا کر ایک دو چھٹانک خالص مزاحیہ ادب ہاتھ میں آتا ہے''۔

(ماہنامہ ''اردو دنیا''، دہلی، مئی ۲۰۱۵ء، ص:۱۶)

رضا نقوی تقریباً پندرہ برسوں تک سنجیدہ شاعری کرنے کے بعد ملکی نظام سے برگشتہ ہو کر طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی طرف مائل ہو گئے۔ انہوں نے ملکی نظام میں پیدا ہوئی ناہمواریوں کے خلاف آواز بلند کرنے کا فیصلہ لیا اور مساوات و انصاف کی خاطر ظرافت کے پیرائے کو اپنا لیا۔ اس فن میں انہوں نے کئی معرکے طے کیے، ان کی ظریفانہ شاعری کے آغاز کا سہرا، ان کے آبائی وطن کھجوا کے ایک بزرگ رشتہ دار کے سر جاتا ہے، جوان دنوں دماغی مرض میں مبتلا تھے۔ ۱۹۴۸ء کی بات ہے، راجندر کالج، چھپرہ کے پرنسپل منورنجن سنہا کی ایک ظریفانہ نظم مقامی اخبار میں طبع ہوئی تھی، جس میں ایم ایل اے کو طنز و تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ بزرگ رشتہ دار نے رضا نقوی کو یہ نظم سنا کر للکارتے ہوئے فرمایا کہ ''بڑے شاعر بنتے ہو۔۔۔ اگر صلاحیت ہے تو لکھو ایسی نظم''۔ اس نظم کا ایک شعر یوں تھا ۔

اے میں لے، او میں لے
لوہا میں لے ، چھوا میں لے

بزرگ محترم کے چیلنج نے ان کی وہبی شعری صلاحیتوں کو ایسی مہمیز لگائی کہ شام تک ایک نظم مکمل ہو گئی۔ رضا نقوی جس محکمہ سے تعلق رکھتے تھے، وہاں وہ سیاسی نظام کی خرابیوں کا مشاہدہ کرتے رہے تھے۔ ان کی پہلی طنزیہ و مزاحیہ نظم ''ایم ایل اے'' (۱۹۴۹ء) تھی، جس میں سیاسی و سماجی رہنما کی بدعنوانی اور داخلی کمزوریوں پر بے باکی سے چوٹ کرتے ہوئے اس دور کے آئین اور قوانین کا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ اس نظم میں کہیں بھی پھکڑ پن، یا سوقیانہ انداز نہیں ہے۔ واہی نے اس میں بظاہر ایم۔ ایل۔ اے کو ہدف بنایا ہے؛ لیکن بباطن ان کا نشانہ سیاسی گراوٹ ہے۔ ان کی یہ پہلی نظم نامور صحافی و افسانہ نگار سہیل عظیم آبادی کے توسط سے روزنامہ ''ساتھی'' پٹنہ میں شائع ہوئی۔ رضا نقوی سرکاری ملازمت کے سبب اس نظم کو اپنے نام سے شائع کرانا نہیں چاہتے تھے، لہٰذا انہوں نے اپنے دوست سہیل عظیم آبادی کو لکھا کہ وہ اسے مزاحیہ کالم ''راہی کے قلم سے'' میں کسی فرضی نام سے شائع کر دیں۔

سہیل صاحب ان دنوں ''ساتھی'' میں ایک مستقل کالم ''راہی کے قلم سے'' کے عنوان سے لکھتے تھے۔ انہیں رضا نقوی کی نظم اس قدر پسند آئی کہ انہوں نے 'راہی' کے ہم قافیہ 'واہی' کے فرضی نام سے اس نظم کو 'ایم ایل اے' عنوان کے تحت ''ساتھی'' میں شائع کر دیا۔ مذکورہ نظم کی اشاعت اور رضا نقوی سے واہؔی بننے کا یہ دلچسپ قصہ پہلے آپ خود، ان کی زبان سے سنئے:

''سنجیدہ نظموں کا جہاں تک تعلق ہے تو یہ سلسلہ ۱۹۴۸ء تک چلتا رہا، پھر اس زمانے میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا اور یہی سبب بنا میری ظریفانہ شاعری کا۔ ہوا یوں کہ ۱۹۴۸ء میں غالباً دسمبر کی کوئی تاریخ تھی، میں کرسمس کی تعطیل میں والدین سے ملنے گھر گیا تھا، ایک دن صبح کے وقت گھر سے باہر مردانہ بیٹھک کے چبوترے پر بیٹھا منہ ہاتھ دھو رہا تھا کہ دیکھا ایک بزرگ رشتہ دار جو کئی بار دماغی امراض میں مبتلا ہو کر رانچی ہسپتال میں زیر علاج رہ چکے تھے اور اس وقت تک نارمل نہیں ہوئے تھے، میری جانب تیز قدموں سے چلے آ رہے تھے۔ ٹوپی، شیروانی، چوڑی مہری کا پائجامہ پہنے ہوئے ہیں، سفید داڑھی چہرے پر بکھری ہوئی ہے، سرخ سرخ آنکھیں، ایک ہاتھ میں موٹا ڈنڈا لیے ہوئے ہیں۔ میرے قریب آ کر زمین پر ڈنڈا مار کر کرخت آواز میں بولے۔ ''رضا میاں کیا کر رہے ہو؟ بڑے شاعر بنتے ہو، ادھر آؤ میرے پاس''۔

یہ بے ربط گفتگو سن کر میرے اوسان خطا ہو گئے۔ فوراً کھڑا ہو گیا اور ان کے ڈنڈے سے محفوظ رہنے کے لیے چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میرے عزیز نے مجھے خونخوار نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ 'ادھر آؤ' پھر مردانہ بیٹھک سے گزرتے ہوئے بڑے ہال میں داخل ہو گئے، اندر کئی بڑی بڑی چوکیوں کا فرش تھا، کچھ کرسیاں اور میز ادھر ادھر پڑے ہوئے تھے، چوکیوں کے فرش پر ڈنڈا رکھنے کے بعد میری جانب متوجہ ہوئے، کہنے لگے ''بڑے شاعر بنتے ہیں، سنو یہ نظم اور صلاحیت ہو تو لکھو ایسی نظم، پھر جیب سے کاغذ کا ایک ٹکڑا نکال کر تھرک تھرک کر ترنم سے پڑھنے لگے۔

اے میں لے، او میں لے
لوہا میں لے ، چھوا میں لے

وغیرہ وغیرہ۔ میں دور کھڑا یہ تماشہ دیکھتا رہا، جب یہ بے تکا کلام ختم ہوا تو کچھ

کہے بغیر ڈنڈا اٹھا کر اس تیز رفتاری سے واپس چلے گئے، جس تیزی سے آئے تھے۔

یہ تک بندی ہندی کے ایک شاعر پرنسپل منورنجن سنہا کے زور قلم کا نتیجہ تھی، منورنجن سنہا اس زمانے میں راجندر کالج، چھپرہ کے پرنسپل تھے، انہوں نے اس نظم میں ایم ایل اے حضرات کو ہدف بنایا تھا۔

اس کے بعد معاً ذہن میں یہ بات آئی کہ جب میں خود اسمبلی میں ملازم ہوں اور روزانہ ہی ارباب سیاست کو قریب سے دیکھنے کا شرف حاصل کرتا ہوں تو کیوں نہ میں بھی ایم ایل اے حضرات کی خبر لوں، چنانچہ دوپہر تک دس بارہ اشعار لکھ ڈالے۔ یہ وہ زمانہ تھا، جب سہیل عظیم آبادی پٹنہ سے روزنامہ ''ساتھی'' نکالا کرتے تھے اور اس اخبار میں ایک مزاحیہ کالم ''راہی کے قلم سے'' کے مستقل عنوان سے لکھا کرتے تھے۔ میں نے اپنے وہ اشعار اسی دن ان کے نام سے تاکید کے ساتھ پوسٹ کر دئے کہ میرا نام ظاہر کئے بغیر کسی فرضی نام سے ''ساتھی'' میں شائع کر دیں۔ سہیل نے مذاق یہ کیا کہ راہی کے ہم قافیہ لفظ واہی کے نام سے ''ایم ایل اے'' کی سرخی لگا کر وہ اشعار شائع کر دئے۔ یوں میرے اچھے بھلے نام کی مٹی پلید ہوئی۔

سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے میرا اصل نام ظاہر کرنا بہت سی مشکلات کا پیش خیمہ بن سکتا تھا۔ لہٰذا میں نے اس مذاق کو خندہ پیشانی سے برداشت کر لیا۔

تعطیل کے بعد جنوری ۱۹۴۹ء میں جب وطن سے پٹنہ واپس آیا تو یہاں میری نظم کا چرچا ہر زبان پر تھا۔''

(''ادب نکھار''، رضا نقوی واہی نمبر، مئی جون ۱۹۸۳ء، ص: ۱۷-۱۸)

گویا رضا نقوی سے واہؔی تک کا سفر ایک دلچسپ واقعے کی مرہون منت ہے۔ ان کے بزرگ رشتہ دار نے ان کی شاعری کے ڈھب کو ہی بدل ڈالا۔ وہ تو اچھی خاصی سنجیدہ شاعری کر رہے تھے اور جس سے دست کش ہونے کا ارادہ بھی نہیں رکھتے تھے؛ لیکن اپنے عزیز کے چیلنج کے بعد وہ یہ سوچنے پر مجبور ہوئے کہ اسمبلی میں تو پیہم سیاسی کرتب بازیاں دیکھتے رہتے ہیں؛ اس لیے وہ ایسی شاعری بہ آسانی کر سکتے ہیں، انہیں تو شاعری کے لیے موضوعات ڈھونڈنے کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ یہ خیال آتے ہی اشعار موزوں ہونے لگے اور پہلی طنزیہ و مزاحیہ نظم تخلیق ہوئی۔ ادبی حلقے میں

اس نظم کی زبردست پذیرائی ہوئی اور قارئین کا ''ساتھی'' کے مدیر سے واہیؔ کی مزید نظموں کی اشاعت کا شدید مطالبہ ہونے لگا تو سہیل صاحب نے رضا نقوی واہیؔ سے اس طرح کی اور نظمیں لکھنے کی گزارش کی۔ قارئین کی حوصلہ افزائی اور سہیل عظیم آبادی کی پیہم فرمائش کے پیش نظر واہیؔ نے اس شرط پر لکھنے کے لیے آمادگی کا اظہار کیا کہ ہر حال میں ان کا نام پوشیدہ رہنا چاہیے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی پوری تخلیقی واختراعی صلاحیتوں کو طنز وظرافت کے لیے وقف کر دیا اور پھر ''ساتھی'' میں تقریباً ہر ہفتے ان کی نظمیں چھپنے لگیں۔ قلیل مدت میں ان کی نظموں کی دھوم ایسی مچی کہ ہندو پاک کے متعدد اخبارات میں ان کی تخلیقات ڈائجسٹ ہونے لگیں۔ اس طرح ادبی دنیا میں واہیؔ کا نام چل نکلا اور وہ طنز ومزاح کے آسمان پر درخشاں ستارے کی مانند چمکنے دمکنے لگے۔ رضا نقوی نے اصلاح معاشرہ کے لیے واہیؔ بن کر جو تخلیقی سفر شروع کیا، وہ تادم حیات بڑی توانائی، خوش اسلوبی اور ایک خاص معیار کے ساتھ جاری وساری رہا۔

روز نامہ ''ساتھی'' کے مدیر اعلیٰ عبدالقیوم انصاری حکومت بہار میں وزارت کے عہدہ پر متمکن تھے، حالاں کہ رضا نقوی سے اسمبلی میں ان کی روزانہ ملاقات ہوتی تھی؛ مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ حضرت واہیؔ یہی ہیں۔ ایک روز سہیل عظیم آبادی ان کے چیمبر میں بیٹھے محو گفتگو تھے، وہاں رضا نقوی بھی تشریف رکھتے تھے۔ اچانک عبدالقیوم انصاری نے سہیل سے دریافت کیا کہ یہ واہیؔ کون حضرت ہیں؟ جن کی نظمیں ''ساتھی'' میں متواتر چھپ رہی ہیں اور ان میں بلا کی شوخی، شگفتگی اور طنز وظرافت ہوتی ہیں۔ سہیل عظیم آبادی نے کہا کہ آپ انہیں نہیں جانتے، حالاں کہ آپ روزانہ ان سے ملتے ہیں۔ اب واہیؔ کو کاٹو تو خون نہیں، وہ اشارے سے سہیل عظیم آبادی کو منع کرتے رہے کہ اس راز کو فاش نہیں کریں؛ مگر انہوں نے کہہ دیا کہ وہ تو آپ کے سامنے ہی بیٹھے ہوئے ہیں۔ اس پر عبدالقیوم انصاری نے حیرانگی سے دریافت کیا کہ یہ رضا نقوی، یہی واہیؔ ہیں؟ ہاں بھئی، یہی واہیؔ ہیں۔

رضا نقوی خجالت سے بیٹھے رہے؛ اس لیے کہ وہ اپنی کئی نظموں میں عبدالقیوم انصاری کو ہدف طنز بنا چکے تھے۔ عبدالقیوم انصاری بڑے وسیع القلب اور وسیع النظر انسان تھے۔ انہوں نے واہیؔ کی نظموں کی خوب ستائش کی اور کہا کہ آپ تو چھپے رستم نکلے۔ اس دوران انہوں نے کہا کہ اب آپ کی نظموں کا مجموعہ منظر عام پر آنا چاہیے۔ واہی نے فرمایا کہ مجموعے کی اشاعت کے لیے پیسے کہاں سے لاؤں۔ یہ سنتے ہی انہوں نے اس کی اشاعت کی پوری ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ اس طرح ۱۹۵۰ء

میں عبدالقیوم انصاری صاحب کی مالی اعانت سے واہیؔ کا پہلا شعری مجموعہ ''واہیات'' کے نام سے اشاعت پذیر ہوا۔ اس بابت خود واہی نے لکھا ہے کہ:

> ''عبدالقیوم انصاری کی مالی امداد سے میرا پہلا مجموعۂ کلام ''واہیات'' کے نام سے شائع ہوا۔ اب یہاں حضرت عبدالقیوم انصاری کی وسعت قلب دیکھئے، وہ ایک وزیر تھے اور ہندوستان نیا نیا آزاد ہوا تھا؛ لیکن ان کو ادب اور سیاست سے اتنا گہرا تعلق تھا کہ انہوں نے ہماری چیزیں چھپوائیں، جب کہ خود انہیں کے خلاف، ان کی جو ریاست تھی، یا ان کی جو سیاست تھی، اس کے خلاف بھی بہت سی نظمیں ہم نے لکھیں؛ لیکن یہ سب دیکھتے ہوئے بھی انہوں نے میرے کلام سے متاثر ہو کر فن کے اعتراف کے بطور امداد دی اور وہ کتاب چھپی''۔

(''ادب نکھار''، رضا نقوی واہی نمبر، مئی جون ۱۹۸۳ء، ص: ۲۰)

رضا نقوی واہی نے طنزیہ ومزاحیہ شاعری کو بڑی سنجیدگی سے لیا اور اپنی ایک منفرد راہ نکالی؛ اسی لیے وہ اکبرالٰہ آبادی کے بعد طنز ومزاح کے ایک عظیم شاعر بن کر ابھرے۔ انہوں نے اپنے عمدہ اور معیاری تخلیقات سے اکبر اور دلاور کی روایت کی توسیع کرتے ہوئے اردو کی ظریفانہ شاعری کو بلند مقام تک پہنچایا اور اسے اعتبار وافتخار بخشا۔ واہیؔ کے کلام میں مشاہدہ اور موضوعات کا جو تنوع ملتا ہے، وہ کہیں اور نظر نہیں آتا۔ انہوں نے ابتذال اور پھکڑ پن کو اپنے پاس پھٹکنے بھی نہیں دیا؛ بلکہ ہمیشہ شگفتگی، شائستگی اور برجستگی کو مقدم جانا۔ ان کی شاعری میں ہمارے معاشرے کی ناہمواریاں اور خرابیاں ایک وسیع کینوس پر بار پاتی ہیں اور اخلاقی، تعلیمی، تہذیبی اور معاشی تنزلی وغیرہ ہدف طنز بنتی ہیں۔ واہیؔ جب عام زندگی کے رکھ رکھاؤ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ان کے سامنے کچھ ایسے چہرے نمودار ہوتے ہیں، جو سماج کی تعمیر کے لیے جانے جاتے ہیں؛ مگر ان کا عمل تعمیری قطعی نہیں ہوتا؛ بلکہ یہ مذہبیت اور انسانیت کے دشمن ہیں۔

واہیؔ ایسے لوگوں کو براہ راست طنز وہجو کا نشانہ نہیں بناتے؛ بلکہ بذلہ سنجی سے کام لیتے ہوئے ان پر طنز کی ضرب کاری کر جاتے ہیں۔ واہیؔ کی روش منفرد ہے، انہوں نے مزاحیہ سے زیادہ طنزیہ شاعری کی؛ اسی لیے ان کے طنز کے تیر بہت گہرائی تک جاتے ہیں، ان کے طنز کا ہدف تعلیم و تدریس، ادب، مذہب، اخلاق اور سیاست ومعاشرت میں درآئی خرابیاں ہیں، لہٰذا وہ اس کے ذمہ داروں مثلاً: مذہبی وسیاسی رہنما، لیڈر، پلیڈر، پروفیسر، ادیب، شاعر، ڈاکٹر، مولوی، پنڈت کسی کو بھی

نہیں بخشتے، واہی نے ان کی داخلی کمزوریوں کا تمسخر اڑایا ہے۔انہیں خود بھی انفرادیت کا احساس تھا۔ راقم الحروف کے ایک استفسار کے دوران انہوں نے یہ تسلیم کیا تھا کہ وہ مزاحیہ شاعری بھی بہت سنجیدگی سے کرتے ہیں اور بلا شبہ ان کی ظریفانہ شاعری میں یہ سنجیدگی شروع سے آخر تک نظر آتی ہے۔واہی کسی فرد کو نشانہ نہیں بناتے؛ بلکہ سماج پر طنز کے تیر چلاتے ہیں۔وہ جزو کی نہیں کل کی بات کرتے ہیں۔وہ انسان، سماج اور اس کے اندر باہر چاروں طرف پھیلی ہوئی کائنات کے ہر معاملے پر تیر ونشتر چلاتے ہیں، ساتھ ہی ساتھ وہ زخم پر مرہم بھی لگاتے ہیں۔بقول نصرت ظہیر ''ان کا طنز محض جلی کٹی سنانے اور قصاب کی طرح چھری سے کاٹنے پیٹنے جیسا طنز نہیں؛ بلکہ گہری سماجی بصیرت رکھنے اور شعور کی رگوں میں اتر جانے والا طنز ہے، جس میں کاٹ نہیں گدگداہٹ ہے اور یہی گدگداہٹ، پھول کی پتی سے تراشنے کا ہنر بن جاتی ہے۔'' واہی کی ظریفانہ شاعری کا دائرہ بہت وسیع ہے۔انہوں نے اپنی فکر وفن اور شعری اسلوب کی شائستگی سے ہر مکتبۂ فکر کے قارئین کو اپنا گرویدہ بنایا۔پروفیسر اختر اورینوی نے ان کی ظریفانہ شاعری کے تجزیاتی مطالعہ کے بعد جو نتیجہ اخذ کیا ہے، وہ حرف بہ حرف صحیح ہے۔موصوف لکھتے ہیں:

> ''واہی کی ظریفانہ شاعری کا تجزیاتی جائزہ لیتے ہوئے ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے تجربات کا اظہار شاعرانہ طور پر ہوا ہے۔ان کے حواس بیدار ہیں، احساس ذکی، جذبہ جاگا ہوا؛ مگر متوازن اور تخیّل گہرا، مشاہدہ اور ذکاوت احساس کی مثالیں مختلف نظموں میں ملتی ہیں.... واہی کے فن میں جذبی ردعمل نمایاں ہے؛ لیکن ان کے یہاں جذبات کا فنکارانہ اظہار پایا جاتا ہے۔اس کی مثالیں ان کی ہر کامیاب نظم میں ملتی ہیں۔اس طرح واہی اپنی ظرافت کو تخیل سے رنگین، پرکار، وسیع، بلند یا عمیق بنادیتے ہیں۔ان کے یہاں معنی آفرینی بھی پائی جاتی ہے.....ان کی ظریفانہ شاعری کہیں پر رکیک اور سوقیانہ نہیں ہوتی۔ان کے یہاں نہ بھونڈہ پن ہے اور نہ کھردرا پن۔واہی کی شاعری میں کسی پہلو سے ناتراشیدگی نہیں ملتی۔ان کی نظمیں شائستہ اور مہذب ظرافت کا نمونہ ہیں۔ان میں نشتریت ضرور پائی جاتی ہے؛ لیکن ساتھ ساتھ وہ زخم پر مرہم بھی لگاتی ہے۔مختصر یہ کہ واہی کی شاعری قدر اعلیٰ کی چیز ہے''۔

(''نشتر ومرہم''، از: رضا نقوی واہی، ص: ۲۳-۲۴)

واہی کی تصانیف پر ناقدانہ نظر

رضا نقوی واہی کا پہلا شعری مجموعہ ''واہیات'' ۱۹۵۰ء میں عبدالقیوم انصاری مرحوم، سابق وزیر، حکومت بہار کی مالی اعانت سے شائع ہوا۔اس مجموعے کی اشاعت سے واہی کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور بڑے بڑے مشاعروں میں انہیں بلایا جانے لگا۔۱۱۲ صفحات پر محیط اس مجموعے میں ۱۹ نظمیں ''ایم ایل اے''، ''راشٹر بھاشا''، ''آر ایس ایس''، ''پوسٹ وارڈ یویلو پمنٹ''، ''آزادی''، ''گرومور فوڈ''، ''جنرل اسپتال''، ''مچھروں کا سوراج''، ''پیروی جگ''، ''میونسپلٹی میں بزم مشاعرہ''، ''ہارٹ فیلیور''، ''بلیک مارکیٹ''، ''بلیک مارکٹیر''، ''کنٹرول''، ''لیلائے کرپشن''، ''لال فیتہ''، ''لیڈری کا نسخہ''، ''چار سو بیس'' اور ''جاگیرداری'' عنوانات کے تحت شامل ہیں۔اس کا مقدمہ پروفیسر اختر اورینوی نے ''ہم بتلائیں کیا؟'' کے عنوان سے قلم بند کیا ہے۔اس مجموعے کی تقریباً سبھی نظمیں سہیل عظیم آبادی کے معروف اخبار ''ساتھی'' میں شائع ہو کر خواص وعام سے داد وتحسین پا چکی ہیں۔زیر نظر مجموعہ اگرچہ مختصر ہے؛ لیکن اس کے مشمولات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔یہی وجہ ہے کہ ''واہیات'' کی ادبی حلقے میں خاطر خواہ پذیرائی ہوئی اور واہی کو ادبی دنیا میں طنز ومزاح کے ایک اہم شاعر کی حیثیت سے شہرت ملی۔

''واہیات'' کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ واہی کو طنز ومزاح کے حربوں کا علم ہے اور انہوں نے طنزیہ ومزاحیہ شاعری کو بڑی سنجیدگی سے اپنایا ہے۔انہیں زبان وبیان پر عبور حاصل ہے۔وہ تیکھی

اور میٹھی باتیں کرنے کا سلیقہ خوب جانتے ہیں اور انہیں ہنسنے ہنسانے، رُلانے کا ہنر بھی معلوم ہے۔ وہ ایسے ہی الفاظ، رمز و کنایہ، علامت اور ڈکشن کو بروئے کار لاتے ہیں، جو طنز و ظرافت کی شاعری کے لیے مناسب ہوتے ہیں۔ پروفیسر اختر اورینوی نے اس مجموعہ پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

''واہیات' کی پیش کردہ دنیا نامعقول سہی پر خاص طور پر قابل ذکر ضرور ہے۔ فنکار نے یہ دنیا محض زور تخیل سے پیدا نہیں کی؛ بلکہ آئے دن کی پیش پا افتادہ حقیقتوں کو اس انداز و رنگ سے مرتب کر دیا ہے کہ ہنسی بھی آتی ہے اور رونا بھی آتا ہے۔ بھلا اس عالم میں کیا کیا ہے؟ ایم ایل اے، آر ایس ایس، مچھر، آزادی، کرپشن، پیروی، ترقی، اسپتال، بلیک مارکیٹ، کنٹرول، لال فیتہ اور ہارٹ فیلیور وغیرہ۔ آپ حضرت واہی کے سنسار باشیوں کے درشن کیجئے گا اور دل تھام کے بیٹھ جایئے گا کہ میری باری آئی، الامان! لیکن واہی کی دنیا بڑی عجیب، انمل، بے جوڑ اور گڈمڈ سی ہے، اگر ایسی نہ ہوتی تو ''واہیات'' کی تخلیق کس طرح ہوتی۔ اللہ غریبی کو قائم رکھے، ہم آپ خیرات دے کر نیکی تو کما سکتے ہیں۔ خدا کی شان؟ زکوٰۃ کے لیے کیسے کیسے نادر موقعے اور محل نکل آتے ہیں؟ دنیا اور اس کی خلقت نامکمل اور ناقص رکھی ہی اس فلسفہ کے ماتحت گئی ہے کہ اہل کمال اسے کامل بنائیں۔ بھگوان بھلا کرے میونسپلٹی کے افسر اعلیٰ کا کہ ان کی توجہات خاص کے طفیل واہیؔ نے ایک معرکہ آرا نظم لکھ لی اور پھر کن کن بزرگوں کا شکریہ ادا کروں۔ ''گرومورفوڈ'' کے شعبہ سے لے کر ایوان اعلیٰ تک کی بالانشیں ہستیاں ہمارے شکریہ خاص کی مستحق ہیں؛ بلکہ خود ملاء اعلیٰ بھی جس کے تصور سے بہ سوز دپرم۔ اللہ اللہ! کرشمہ دامن دل میں کشت کہ جا ایں جاست!''

(''واہیات'' از: رضا نقوی واہی، ص: ۷-۸)

واہی کی نظمیں ہماری سیاسی، سماجی، معاشی، ثقافتی اور معاشرتی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتی ہیں۔ وہ جب سماج و معاشرے کا بہ نظر غائر مطالعہ و مشاہدہ کرتے ہیں تو انہیں بعض معاشرتی، ثقافتی، سماجی اور سیاسی خامیوں و کوتاہیوں کا شدت سے احساس ہوتا ہے۔ اس صورت حال میں ان کا دل کڑھتا ہے؛ لہٰذا وہ سماج و معاشرے میں بدامنی، انتشار اور بدعنوانی پھیلانے والے لوگوں کی شدید نکتہ چینی کرتے ہیں اور ان پر پھبتیاں بھی کستے ہیں، طنز کے نشتر چبھوتے ہیں؛ تاکہ انہیں اپنی غلطیوں کا احساس ہو سکے۔ واہیؔ نے ''ایم ایل اے''، ''آزادی''، ''راشٹر بھاشا''، ''آر ایس ایس''، ''لیڈری

کا نسخہ''، ''لال فیتہ''، ''گرومورفوڈ''، ''میونسپلٹی میں بزم مشاعرہ''، ''لیلائے کرپشن''، ''بلیک مارکیٹ''، ''بلیک مارکٹیر'' میں ملک کی سیاسی تنزلی اور سماجی بدحالی پر شدید نکتہ چینی کی ہے۔ آج نام نہاد قومی رہنماؤں کو عوام کی بہبودی سے کوئی سروکار نہیں۔ ان کا واحد مقصد الیکشن جیتنا، پارلیمنٹ اور اسمبلیوں کی نشستوں پر قبضہ جمانا، وزارت کے عہدہ پر فائز ہونا اور مختلف طریقوں سے دولت بٹورنا ہے۔ انہوں نے رشوت، اقربا پروری اور کرپشن کا بازار گرم کر رکھا ہے۔ مختلف فلاحی اسکیمیں بنائی جاتی ہیں؛ لیکن وہ بھی زراندوزی کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ پانچ سالہ منصوبے بنائے جاتے رہے؛ لیکن ہر منصوبے کے بعد مہنگائی بڑھتی گئی، بیروزگاری میں اضافہ ہوا۔ ''گرومورفوڈ'' کی اسکیم نافذ کی گئی، اجناس کی پیداوار میں اضافہ تو نہیں ہوا؛ بلکہ اسکیم کی ساری رقم متعلقہ عہدہ داروں کے ٹی اے، ڈی اے کی نذر ہو گئی۔ ہر شہر اور ڈویژن میں کارپوریشن قائم کئے گئے؛ تاکہ گندگی ختم ہو اور بیماریاں نہ پھیلے؛ لیکن حالت جوں کی توں رہی۔ واہیؔ نے ''کارپوریشن میں بزم مشاعرہ'' میں کارپوریشن کی خوب ہجو کی ہے۔ کارپوریشن میں مشاعرہ ہوتا ہے، نابدان کا کیڑا، کوڑا، تعفن، مچھر، بیماریاں سب اپنے گن گاتے ہیں۔ بیماریاں کہتی ہیں:

ہے مگر کون جس کی طاقت نے — یوں بنایا ہے ہم کو خود مختار
وہ ہمارے ہیں اسپیشل افسر — جن پہ ہے اپنی زندگی کا مدار
وہ سلامت رہیں ہزار برس — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

ملک میں رشوت اور کرپشن کا بول بالا ہے، بلیک مارکیٹ اور چور بازاری عام ہے، دفاتر نوابی دربار ہیں، جہاں لال فیتے کے سبب کوئی کارروائی وقت پر نہیں ہوتی۔ واہیؔ اس کی ایک مثال دیتے ہیں:

حکم پنشن کا دفاتر سے ہے چلتا اس وقت
جب پہنچ جاتے ہیں تا ملک عدم پنشن خوار

نظم ''پوسٹ وار ڈیویلوپمنٹ'' کا کلیدی بند ملاحظہ ہو:

بعد از جنگ ترقی کی سنہری اسکیم — ایک انجن ہے کہ جس میں نہیں مطلق اسٹیم
کاغذی پھول ہے جس میں نہ کشش ہے نہ شمیم

''آزادی'' ایک بے حد فکر انگیز نظم ہے۔ اس میں طنز کی نشتریت کے ساتھ تشبیہات واستعارات کی جدت وندرت اور شگفتگی بھی ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

آزادی کی جئے کار ہوئی   خالص دیسی سرکار ہوئی
نیتاؤں کو سوراج ملا   بھارت کا تخت و تاج ملا
لفظوں کی پھر دھینگا مشتی   ساشن کے اکھاڑے میں کشتی
کانسٹی ٹیوشن کی پھر ہل چل   دلی میں پھر بات بتوّل

یہ نظم رواں اور عضویاتی تکمیل رکھتی ہے،الفاظ کے مناسب اور برمحل استعمال سے اس میں لطیف مزاح اور طنز کے اثرات پیدا کئے گئے ہیں،انگریزی اور ہندی الفاظ مضحک صورت کو ابھارنے میں معاون ہیں،واہی نے اس میں دلکش حقیقت نگاری کی ہے۔چند حقیقت آمیز طنزیہ اشعار دیکھئے:

سو بات میں بس اک کام ہوا   اس ملک کا بھارت نام ہوا
کچھ سڑکوں کے نام بھی بدلے   شہر کے عرف عام بھی بدلے
آزادی کا من و سلویٰ   گرم کچوری تازہ حلوہ
ہر دیس میں ساتھی بھیجے گئے   جاپان کو ہاتھی بھیجے گئے

اور ہمارے جنرل اسپتال کے بارے میں واہی بتاتے ہیں کہ:

بلیک مارکیٹنگ اس جگہ نہیں ہوتی   خریدتے ہیں یہاں لوگ موت سستے دام

پیروی اور اقربا پروری نے تو ملک کی حالت اور بھی خستہ کر ڈالی۔نظم ''پیروی جگ'' کے یہ کاٹ دار اشعار دیکھئے:

گدھوں کے سر پہ سینگ جماتی پیروی   جاہل کو فخر قوم بناتی ہے پیروی
سچ کو سفید جھوٹ بناتی ہے پیروی   دن کو سیاہ رات دکھاتی ہے پیروی

پروفیسر اختر اورینوی نے اپنے مقدمہ میں بجا فرمایا ہے کہ:

''بلیک مارکیٹ،کنٹرول،لیلائے کرپشن،لال فیتہ،لیڈری کا نسخہ اور جاگیرداری بہت ہی کامیاب نظمیں ہیں،ان میں حقیقت وحسن کا ازدواج ہوا ہے،ہر نظم ایک ایسے مرکزی تجربہ پر مبنی ہے،جو جذباتی اور تخیلی تجربہ بن کر فنکارانہ ہوگئی''۔

بلاشبہ واہی نے مذکورہ نظموں میں عوامی زندگی کے مختلف مسائل کو اپنے مخصوص انداز بیان،فکر وآہنگ،منفرد لب ولہجہ اور طنزیہ اسلوب میں کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ملک میں کرپشن کا بول بالا ہے،اس سے کوئی بھی شعبہ محفوظ نہیں۔آج معمولی کلرک سے لے کر افسر اعلیٰ اور ارباب سیاست

کے چھوٹے بڑے سبھی رہنما اس کے اسیر ہو کر رہ گئے ہیں۔

اس دشمن ایماں نے کسی کو بھی نہ چھوڑا   جو،اس کے مخالف تھے غرور ان کا بھی توڑا
دل اپنی طرف قوم کے لیڈر کا بھی موڑا
جو دیش کے سیوک تھے اہنسا کے پجاری   خود ان سے حسینہ نے کہا 'میں ہوں تمہاری'
اور ان پہ بھی الفت کا جنوں ہو گیا طاری
اب دیش کی سیوا کی بھلا کیا ہے ضرورت   اب وقت کہاں ہے جو کریں قوم کی خدمت
اب وہ ہیں اور اس شوخ کی آغوش محبت

واہی اپنے اوّلین مجموعۂ کلام سے ہی طنز وظرافت کی دنیا میں مشہور ومعروف ہو گئے،لوگوں کو اندازہ ہوا کہ ان کا اگلا قدم مزید ترقی یافتہ ہوگا اور وہ اپنی طنزیہ ومزاحیہ شاعری کو آفاقیت کی منزل سے ہمکنار کرنے میں کامیاب ہوں گے۔

ان کا دوسرا شعری مجموعہ ''طنز وتبسم'' ۱۹۶۳ء میں منظر عام پر آیا۔اس کا ''پیش لفظ'' مشہور مزاح نگار احمد جمال پاشا نے تحریر کیا۔اس مجموعے کے متعلق ان کی رائے ہے کہ:

''رضا نقوی واہی نے ''واہیات'' سے ''طنز وتبسم'' تک تیرہ سال کی ادبی مسافت جس حسن وخوبی سے طے کی ہے،اس سے ان کی ادبی ریاضت،خلوص اور فن سے لگاؤ کا اظہار ہوتا ہے.....واہی کے یہاں موضوعات کی ایک وسیع کائنات ملتی ہے،جس میں وہ زندگی کے سیاسی،سماجی،انسانی،معاشی،قومی،اجتماعی اور ادبی مسائل کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں''۔

(''طنز وتبسم''از:رضا نقوی واہی''پیش لفظ'')

اس مجموعے کو مشہور طنز ومزاح نگار انجم مانپوری کے نام معنون کیا گیا ہے۔اس میں ۷۵رنظمیں شامل ہیں،جن کے عنوانات اس طرح ہیں:''پروگرام''،''انٹلکچوئل''،''مشاعرہ اور کامریڈ''،''گویا شاعر''،''شاعر مئے خوار''،''نقاد''،''محقق''،''آئینہ''،''حضرت خدنگ''،''ٹیڈی گرل''،''ٹیڈی بوائے''،''لیبر لیڈر''،''حضرت کاتب''،''عرض کاتب''،''شاعر بسیار گو''،''انتقال کے بعد''،''پی ایچ ڈی''،''پروفیسر نامہ''،''لیڈری کا نسخہ''،''ریل کا سفر''،''انٹرویو''،''میں اسٹوڈینٹ ہوں''،''ماہر فن''،''اے لیکچرر''،''لال فیتہ''،''جاگیرداری''،''یو این او''،''نئی یونیورسٹی''،''چاؤ ماؤ اسکیم''،''پیکنگ ریڈیو''،''چینی

رجز''، ''چینی دسترخوان''، ''بلیک مارکیٹ''، ''بلیک مارکٹئیر''، ''کنٹرول''، ''جنرل اسپتال''، ''کرپریشان''، ''مچھروں کا گیت''، ''کارپوریشن میں مشاعرہ''، ''اشٹ گرہ''، ''گھریلو منصوبہ''، ''شکوہ اللہ سے خاکم بہ دہن ہے مجھ کو''، ''ایڈیٹر کا دردسر''، ''رسائل مفت حاصل کرنے کی ترکیب''، ''رسائل میں چھپنے کی ترکیب''، ''مولوی اور کامریڈ''، ''اے میری زیرپائی''، ''مشاعرہ''، ''بانیان مشاعرہ''، ''مشاعرہ سے پہلے اور بعد''، ''اللہ رے مادّہ''، ''دنیا کی حدیں چار ہیں، چاروں سے لڑائی''، ''شہرت اضافی''، ''چمر چٹ''، ''یہ لفافے''، ''ٹیوشن'' اور ''نقاد چی''۔ یہ نظمیں ہندوستان اور پاکستان کے اہم اور مشہور رسالوں میں طبع ہو چکی تھیں۔ ''پروگرام''، ''گویا شاعر''، ''پی ایچ ڈی''، ''نقاد''، ''محقق''، ''حضرت کاتب''، ''عرض کاتب''، ''انتقال کے بعد''، ''پروفیسر نامہ''، ''انٹرویو''، ''میں اسٹوڈنٹ ہوں''، ''ٹیوشن''، ''اے میری زیرپائی''، ''ریل کا سفر'' وغیرہ اس مجموعے کی خاص نظمیں ہیں جو رضا نقوی واہی کی اعلیٰ خلاقانہ صلاحیت کا ثبوت بہم پہنچاتی ہیں۔ زیرِنظر مجموعے میں ''واہیات'' کی وہ نظمیں بھی شامل کرلی گئی ہیں جنھیں غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی تھی۔

''طنز و تبسم'' میں واہیؔ نے اپنے زمانے کے برننگ ایشوز کو موضوعِ سخن بنایا ہے، انہوں نے عصری مسائل کو بے باکی اور شائستگی سے پیش کیا ہے۔ اس مجموعہ کو بہت سراہا گیا اور واہی کی بطور طنز نگار خوب قدر و منزلت ہوئی۔ اس کے مشمولات میں قہقہہ کم اور زیرِلب تبسم کی کیفیت زیادہ ہے۔ واہیؔ نے سیاست، ادب، ثقافت اور مذہب میں در آئی خرابیوں کو طشت ازبام کیا ہے۔ انہوں نے ہمارے جاں بہ لب معاشرے کی ہر دکھتی رگ پر نشتر زنی کی ہے:

کہنے کو جو دماغ ترقی پسند ہے — کھڑکی اسی دماغ کی واللہ بند ہے
زندانِ دل کا ایک بھی دروازہ وا نہیں — کنڈی چڑھی ہے کوئی دریچہ کھلا نہیں
اللہ رے احتیاط کہ پردے بھی ہیں کھنچے — مسموم ہے ہوا کوئی جھونکا نہ آ گھسے
ڈر ہے کہیں دریچہ کوئی باز ہو نہ جائے — نازک مزاج فکر ہے ناساز ہو نہ جائے

(مولوی اور کامریڈ)

کرپشن سے مقدس تعلیمی ادارے بھی محفوظ نہیں رہ سکے۔ معاشرت اور تہذیب کی پامالی نے اس شعبے کو بھی اپنی زد میں لے لیا ہے، لہٰذا نہ تو اب پہلے جیسے طالب علم ملتے ہیں اور نہ ہی پہلی جیسی تعلیم اور نہ ہی پہلے جیسے اساتذہ کرام۔ واہیؔ نے ''میں اسٹوڈنٹ ہوں''، ''انٹرویو''، ''اے لیکچرر''، ''نئی

یونیورسٹی''، ''پروفیسر نامہ''، ''پی ایچ ڈی''، ''محقق''، ''ٹیوشن'' جیسی نظموں میں درس و تدریس کی خرابیوں کو نشان زد کیا ہے۔ نظم ''میں اسٹوڈنٹ ہوں'' میں عصرِحاضر کا طالب علم خود اپنا خاکہ پیش کرتا ہے، وہ کلاس روم میں بیٹھنے کا عادی نہیں؛ بلکہ ہوٹلوں اور سڑکوں پر دنگا کرتا پھرتا ہے، بغیر ٹکٹ بسوں میں سفر کرتا ہے، درسی کتابوں کے بجائے فلمی اور جاسوسی رسالے پڑھتا ہے، امتحانی پرچوں میں الٹے سیدھے جوابات تحریر کرتا ہے اور اس کے والدین ممتحن کے گھروں کے چکر کاٹتے ہیں، خوشامدیں کرتے ہیں، رشوت دیتے ہیں اور اپنے بچوں کو پاس کراتے ہیں:

میں لیکچر روم میں بکواس سننے کا نہیں عادی — اسی پر اونگھتا ہوں ڈسک جو ہوتا ہے آخر کا
سوالاتِ امتحان کے حل کیا کرتا ہوں یوں اکثر — کلیجہ منہ کو آتا ہے مؤرخ کا مبصر کا
میں دے کر امتحاں ہر فکر سے آزاد رہتا ہوں — سپر دابا میاں کے پیروی کرنے کی خدمت ہے
انہیں ہر ممتحن کے گھر کی مٹی کوڑ کھانا ہے — کہ میرا فیل ہونا حق میں خود ان کے مصیبت ہے
کبھی ہوٹل میں دنگا ہے، کبھی سڑکوں پہ بلوہ ہے — مرے کردار میں مستقبلِ انساں کا جلوہ ہے

واہی نے اس نظم میں موجودہ اسٹوڈنٹ کی حقیقی نقش گری کی ہے۔ اس تعلیمی صورت حال میں جس قبیل کے طلبہ ڈگری یافتہ ہو رہے ہیں، اس کا نہایت پر مزاح اور طنز آمیز نقشہ ''انٹرویو'' میں کھینچا گیا ہے۔ یہ نظم قاری کو جہاں ہنسنے پر مجبور کرتی ہے، وہیں درسِ عبرت بھی دے جاتی ہے۔ اس نظم میں موجودہ درس و تدریس کا بھرم بھی کھلتا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ نظم ان تعلیم یافتگان کے لیے لمحۂ فکریہ بھی بن جاتی ہے، جنھوں نے طالب علمی کے زمانے میں حصولِ علم سے کوتاہی برتی اور قیمتی وقت کو عشق و عاشقی، سیر سپاٹے اور مار دھاڑ میں ضائع کر دیا۔ ایسے افراد کے لیے واہی کی نظم ''انٹرویو'' بہت ہی فکر انگیز ہے۔ نظم کے آخری شعر میں شاعر نے امیدوار طالب علم کے مستقبل سے متعلق پیشین گوئی بھی کر دی ہے:

آپ کی تعلیم؟ بی اے پاس ہوں عالی جناب! — کمبی نیشن؟ ہسٹری، اردو ادب، علم الحساب!
ہسٹری؟ اچھا تو یہ کہیے اشوکا کون تھا؟ — پاٹلی پترا کے شاہنشاہ اکبر کا چچا
میرزا غالب کے بارے میں بھی ہیں کچھ جانتے؟ — کیوں نہیں؟ ہم شاعرِ اعظم ہیں ان کو مانتے
ذوق کے شاگرد ہیں، ہم عصرِ میر و شاد ہیں — شاہنامے کے مصنف ہیں، جگت استاد ہیں
شکریہ! حاضر جوابی آپ کی ہے بے نظیر — آپ آگے چل کے بن سکتے ہیں اک اچھے وزیر

یہ بہت تشویش ناک بات ہے کہ آج کا طالب علم، حصول علم کے علاوہ دوسرے جملہ اعمال وافعال میں سرگرم وفعال ہے، لہٰذا اس کے پاس اگر کسی کا فقدان ہے تو وہ ہے علم۔ واہی نے ''انٹرویو'' میں آج کے طلبہ کی حقیقی تصویر کشی کی ہے۔ آج ہمیں ہر قدم پر ایسے طالب علموں سے سابقہ پڑتا رہتا ہے۔ عصری تعلیمی منظرنامے میں صرف طالب علم ہی نہیں استاذ کا کردار بھی بدل گیا ہے۔ اساتذہ نے تعلیم کو کاروبار بنالیا ہے، وہ ٹیوشن پڑھاتے ہیں، پیپر آؤٹ کرتے ہیں اور پیروی کرکے اپنے چہیتے شاگردان کو زیادہ سے زیادہ نمبر دلواتے ہیں اور آگے چل کر یہی درس وتدریس کے پیشے سے منسلک ہو جاتے ہیں۔ طلبہ کی بے اعتدالی، سہل انگاری، اساتذہ کی بدعنوانی و بے عملی، پیروی اور اقربا پروری کے سبب تعلیمی معیار میں سخت گراوٹ آئی ہے۔ اب تو صورت حال یہ ہے کہ:

ڈی لٹ جسے ملا ہے سو ہے وہ بھی لکچرر   پی ایچ ڈی جو ہوا ہے سو ہے وہ بھی لکچرر
پٹنہ کا جو پڑھا ہے سو ہے وہ بھی لکچرر   انگلینڈ جو گیا ہے سو ہے وہ بھی لکچرر
بیرنگ جو پھرا ہے سو ہے وہ بھی لکچرر

تعلیمی نظام کی غیر افادی صورت حال کے پیش نظر تحقیق کا معیار بھی گر گیا ہے۔ ریسرچ اسکالر استاد کی جوتیاں سیدھی کرکے، ان کے گھر کا سودا سلف لاکے اور خوشامدیں کرکے ان سے ہی تحقیقی مقالہ لکھوا کر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کرلیتے ہیں۔ بعض پروفیسروں نے تو مقالہ سازی کا کارخانہ کھول رکھا ہے، وہ تحقیقی مقالے لکھ کر فروخت کرتے ہیں اور پیروی کرکے، ممتحن سے پاس کرواکے پی ایچ ڈی کی ڈگریاں دلاتے ہیں۔ یونیورسٹیوں میں تحقیق کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ طالب علم کو ایم فل، پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگریوں کے لیے تحقیق کے کوچے سے گزرنا پڑتا ہے۔ اساتذہ کی ترقی کا انحصار بھی تحقیقی کام پر ہوتا ہے۔ ان ضروریات نے تحقیق وتنقید کے معیار کو بہت پست کردیا ہے۔ موجودہ محققین کے طریقہ کار کیا کچھ ہوتے ہیں؟ دیکھیے:

ہیں بہ زعم خود محقق آپ ہندوستان کے   آپ نے نقطے گنے ہیں، میر کے دیوان کے
زیر تحقیق آپ کے رہتے ہیں یہ سب مسئلے   کس قدر چوہے پلے تھے گھر میں مومن خان کے
پانچ بج کر پانچ پر یا پانچ بج کر سات پر   داغ نے توڑا تھا دم، زانو پہ منی جان کے
رند نے اک بے وفا کے عشق میں کھائے تھے جو   وہ چھری کے زخم تھے یا گھاؤ تھے کرپان کے
دھن ہے یہ ثابت کریں دلی تھا ملٹن کا وطن   اور سودا کے چچا بوچر تھے انگلستان کے

واہی کی نگاہیں دور بیں اور دور رس تھیں، انہوں نے تحقیق اور تنقید کے میدان میں آنے والے زوال کو بہت پہلے ہی محسوس کرلیا تھا۔ ان کی نظم ''محقق'' ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی تھی اور اس نظم میں موجودہ دور کے محقق کی جو روش ہے، اس پر سے پوری طرح پردہ اٹھتا نظر آتا ہے۔ آج کے محقق کی سہل انگاری جگ ظاہر ہے۔ وہ عموماً کسی شاعر، یا ادیب کی حیات اور کارناموں کو تحقیق کا موضوع بناتے ہیں۔ شاعر، یا ادیب جب تک زندہ رہتا ہے، محقق اس کی طرف متوجہ نہیں ہوتا؛ لیکن جب وہ وفات پاجاتا ہے تو تحقیق کا موضوع بن جاتا ہے۔ عصری تحقیق کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ عام طور سے محقق ایسی سرگرمی میں مبتلا ہو جاتا ہے، جس کا حاصل کچھ نہیں، مثلاً میر کے دیوان کے نقطے گننا، بعض محقق مخطوطات کے عشق میں مبتلا رہتے ہیں اور کرم خوردہ کتابوں میں سر کھپا کر قیاس آرائی سے ان میں ربط پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ معاصر محقق کی یہ فطرت ہوتی ہے کہ وہ ہر درست بات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مثلاً:

گر کسی نے لکھ دیا یہ، میر کے دو ہاتھ تھے   آپ اس کو رد کریں گے اپنی تحقیقات سے
آپ کی تحقیق یہ ہوگی کہ لولہا تھا غریب   اور اسے ثابت کریں گے اس کی کلیات سے

''پی ایچ ڈی'' بھی ایک بے حد خوبصورت اور حقیقت آمیز نظم ہے۔ آج پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے جس طرح کے غیر معیاری تحقیقی مقالے لکھے جارہے ہیں، اسے کئی دہائی قبل واہی کی دور اندیش نگاہوں نے دیکھ لیا تھا؛ اسی لیے وہ اس زمانے کی روش کے مطابق لوگوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ:

جو لوگ ایم اے کرکے بھی بے روزگار ہیں   اور اپنے والدین کے کاندھوں پہ بار ہیں
ان سے ہے میری عرض کہ کل فکر چھوڑ دیں   اور آج ہی سے شغل میں تحقیق کے لگیں
جی لگ گیا تو کام بڑا سود مند ہے   کھل جائے گا دریچۂ قسمت جو بند ہے
ترکیب لکھ رہا ہوں عمل آپ کیجیے   دم بھر میں بیج ڈالیے، پھل توڑ لیجیے

اور اس سلسلے میں واہی جو نسخۂ کیمیا بتاتے ہیں، وہ بھی ملاحظہ کیجیے:

پہنچے جو یوں صحیفۂ نو تا بہ اختتام   ہے اس کے بعد مرحلۂ سجدہ و سلام
یعنی کے بیچ میں ہوں جو ارباب حل وعقد   جھک جھک کے سجدے کیجیے پیش ان کو نقد نقد
بچوں کو ان کے جاکے سنیما دکھائیے   باتیں ہوں ان کی خشک تو مکھن لگائیے

تیور کو ان کے تولئے اپنی نگاہ میں   بچھیے چٹائیوں کی طرح ان کی راہ میں
خدمت میں ان کی خون جگر پانی کیجئے   ہر روز تھوڑی دیر مگس رانی کیجئے
مکھی کو ان کی ناک پہ جانے نہ دیجئے   جوتے تک ان کے گرد کو آنے نہ دیجئے
کیوں مغز صرف کیجئے اندیشہ جات میں   پی ایچ ڈی لوگ بنتے ہیں اب بات بات میں
ہر فرق علم و جہل کا معدوم ہو گیا   کیں جس نے خدمتیں وہی مخدوم ہو گیا

اور پھر وہ تحقیقی مقالہ قلم بند کرنے کا ایک آسان طریقہ یوں بیان کرتے ہیں:

اک دن کسی کباڑی کی دوکاں پہ جایئے   قلمی کوئی کتاب وہاں سے اڑایئے
کوشش رہے کہ ہو کسی شاعر کا وہ کلام   گر مل گیا تو آپ کا ہے ختم نصف کام
تخیل کی مدد سے فسانے تراشئے   ہر اک ورق پہ ٹانکئے دو چار حاشیے
پچھلے محققین کی دو اک کتاب سے   تمہید نقل کیجئے لیکن حساب سے
ان کا مواد ہو مگر اپنا بیاں رہے   اقوال دوسرے کے ہوں اپنی زباں رہے

تحقیق وتنقید میں باہمی رشتہ ہے، جامعات کے اساتذہ کرام سیمیناروں میں تنقیدی مقالے پیش کرتے ہیں، پھر انہیں کتابی شکل میں چھپواتے ہیں۔ یہ کتابیں ان کی ترقی میں معاون ہوتی ہیں۔ جامعات کے باہر بھی اہل قلم نقاد ہیں، مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے، متعصب اور جانبدار، تل کو تاڑ بنانے والے، اپنے گروپ کے غیر معمولی قلم کار کو بلندی پر پہنچا دینے والے اور دوسرے گروپ کے باصلاحیت اور معتبر قلم کاروں میں کیڑے نکالنے، یا بالکل نظر انداز کر دینے والے نقاد۔ واہی معاصر نقادوں کے متعصّبانہ رویے سے سخت دل برداشتہ نظر آتے ہیں۔ پہلے یہ مثل مشہور تھا کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو؛ لیکن واہی کا کہنا ہے کہ آج جو شخص ناکام شاعر، یا ناکام افسانہ نگار ہوتا ہے، وہ تنقید کے میدان میں اتر آتا ہے اور نکتہ چینی کو اپنا شعار بنالیتا ہے، جس ادیب وشاعر سے اس کی بگاڑ ہوتی ہے اس کی مٹی پلید کرنے میں اور جس سے خوش ہوتا ہے اسے آسمان کی بلندی تک پہنچانے میں منہمک نظر آتا ہے، جب کہ خود اس کی علمی صلاحیت اور بصیرت کا حال یہ ہے کہ:

آئے جب علم بیاں کی معنوی تفصیل میں   صنعت ایہام کی دم باندھ دی تعلیل میں
استعارے کو دھڑلے سے کنایہ لکھ گئے   جوش میں تنقید کی ظلمت کو سایہ لکھ گئے

واہی ایسے ناقدین کے غلط رویے کے خلاف آواز بلند کرتے ہیں۔ معاملہ تحقیق کا ہو، یا تنقید کا، ہر جگہ بے اعتدالیاں راہ پا چکی ہیں۔ آج کا محقق ہو، یا ناقد، واہی کے نشتروں سے کوئی نہیں بچ پایا ہے۔ دیکھئے وہ موجودہ دور کے نقاد کا تعارف کتنے دلکش اور دلچسپ ظریفانہ انداز میں کراتے ہیں:

ان سے ملئے آپ ہیں جو ہر شناس نقد فن   کانپتی ہے دبدبے سے آپ کے روح سخن
جب کہ قسمت بٹ رہی تھی عالم ارواح میں   آپ کو رکھا گیا تھا زمرۂ جراح میں
آپ کو اہل قلم سے اک کدورت ہو گئی   نظم ہو یا نثر ہو دونوں ہی سے نفرت ہو گئی
آپ کا قبضہ ہوا تنقید کے میدان پر   اک مصیبت آ گئی شعر وادب کی جان پر
جس سے بگڑے اس کی مٹی آپ نے کردی پلید   ہو گئے خوش جس سے دے دی اسکو شہرت کی کلید
آپ نے زاغ سخن کو بلبل گلشن کہا   آپ نے تک بند شاعر کو امام فن کہا

واہی نے شاعر وادیب، پروفیسر، ڈاکٹر، لیڈر، پلیڈر، مولوی وملّا اور پنڈت کسی کو بھی نہیں بخشا ہے۔ ان کی داخلی وخارجی کمزوریوں کو انہوں نے طنز وتمسخر کا نشانہ بنایا ہے۔ انتہا تو یہ ہے کہ ان کی زد میں حضرت کاتب بھی آئے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ بعض جگہوں پر واہی صاحب بھی کاتبوں کے شکار بنے ہیں:

اے حضرت کاتب شہ اقلیم کتابت   کیوں آپ کو ارباب قلم سے ہے عداوت
کیوں آپ بناتے ہیں بیچاروں کی حجامت   حجام کی قسمت میں ازل سے جو ہے خدمت
اس میں بخدا آپ کو حاصل ہے مہارت   اے حضرت کاتب شہ اقلیم کتابت
اس طرح قلم آپ کا چلتا ہے دھکا دھک   لے جیسے چھلانگیں کوئی برسات کا مینڈک
یہ لفظ اڑا اور وہ جملہ ہوا گنجلک   اک جست میں بن جاتی ہے مضمون کی درگت

واہی کسی فرد واحد کی تضحیک سے گریز کرتے ہیں، اگر انہیں کبھی ایسا موقع ہاتھ آیا بھی تو وہ فرد کے بجائے اس طبقے کو نشانۂ طنز بناتے ہیں، جس سے اس فرد کی وابستگی رہی ہے۔ وہ ان کوتاہیوں کو عیاں کرتے ہیں، جو اس طبقے سے منسلک لوگوں میں قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہیں، اس لحاظ سے ان کا فن تخصیصیت کا نہیں، تعمیم کا ہے۔ اس ضمن میں ان کی پروگرام سریز کی نظمیں مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں، جن میں شاعر، ایڈیٹر، بڑا صاحب، لیڈر، فلسفی، ملا، وکیل، پروفیسر، نقاد اور خود واہی کے

دلچسپ خاکے شامل ہیں۔ چھ سات اشعار پر محیط اس سریز کی نظموں میں مختلف طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے روز و شب کا حال بیان کیا گیا ہے۔ بطور مثال ''ملا کا پروگرام'' ملاحظہ ہو:

ملا کو اگر آپ کبھی ڈھونڈنا چاہیں	وہ پچھلے پہر نفخ کی حالت میں ملے گا
اور صبح کو وہ بندۂ مجبور مراسم	سکڑا ہوا محراب عبادت میں ملے گا
بعد اس کے وہ ہوٹل میں خدا دین میاں کے	ناسازئ معدہ کی شکایت میں ملے گا
اور ظہر کے کچھ بعد وہ لکھتا ہوا تعویذ	عورات محلّہ کی رفاقت میں ملے گا
اور شام کو جنات کی مسجد میں کنویں پر	تسخیر اجنہ کی ریاضت میں ملے گا
اور محفل میلاد ہو یا بزم عروسی	ہر رات وہ بریانی کی دعوت میں ملے گا

واہی نے یہاں نہایت حقیقت پسندانہ انداز میں مُلّا کے مشاغل اور اس کے کردار کے تضادات کو واشگاف کیا ہے۔ یہ پچھلے پہر نفخ کی حالت میں ہوتا ہے، ناسازئ معدہ کی شکایت کرتا ہے، پھر بھی ہر دن وہ ہوٹل میں کھانے اور رات میں بریانی کی دعوت اڑانے سے باز نہیں آتا۔ مُلّا جو کبھی عصر کا عالم ہوتا تھا، سماج و معاشرے کی اصلاح میں لگا رہتا تھا؛ لیکن اب تو وہ توہم پرست عورتوں کے لیے تعویذ لکھنے، رات میں محفل میلاد منعقد کرنے، یا پھر کسی شادی خانہ آبادی میں قاضی نکاح کا رول ادا کرنے میں منہمک نظر آتا ہے۔ اس کا ہر عمل کھوکھلا اور مذہب کی سچی روح سے عاری ہے۔ بظاہر یہ سیدھی سادی نظم ہے؛ مگر تہذیبی و ثقافتی حوالے مفاہیم کی طرحیں کھولنے، نیز معاشرے میں مُلّا کے کردار، مقام، مرتبہ اور اس کی معاشی حالت کا تعین کرنے میں معاون ہیں۔

اس مجموعے میں متنوع نظمیں ہیں۔ واہؔی نے ان میں شائستہ اور دل پر فوری اثر ڈالنے والا لب و لہجہ اختیار کیا ہے، ان کا انداز بیان بھی حد درجہ سادہ؛ مگر شگفتہ ہے۔

واہی صاحب کا تیسرا مجموعۂ کلام ''نشتر و مرہم'' کے نام سے شائع ہوا، یہ مجموعہ ۱۹۶۸ء میں زندہ دلان حیدر آباد کے زیر اہتمام منظر عام پر آیا تھا۔ واہؔی نے اس کا انتساب زندہ دلان حیدر آباد کے نام کیا ہے۔ ''حرف اوّل'' میں ڈاکٹر مصطفیٰ کمال نے رضا نقوی واہؔی کی شخصیت اور شاعری سے متعارف کرایا ہے اور اس کتاب کی اشاعت کی روداد بھی پیش کی ہے، انہوں نے واہی کی شاعری اور ''نشتر و مرہم'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے صحیح فرمایا ہے کہ!

''واہی صاحب کے زیر نظر مجموعے میں ۵۲ر نظمیں شامل ہیں۔ ادبی، سماجی اور

معاشی مسائل، معاشرے کی بے راہ روی اور زوال پذیر اقتدار، ان کے موضوع ہیں، کشاکش زندگی کے اضافے اور افراد کے ذہنی انتشار کی افزونی نے انہیں نئے اور دلچسپ موضوعات فراہم کئے ہیں، چنانچہ واہی کی یہ نظمیں نشتر زیادہ لگاتی ہیں، ان کی شاعری میں طنز کا پہلو نمایاں ہے، وہ طنز و مزاح کو شاید غیر شعوری طور پر خالص اصلاحی مقصد کے لیے برتنا چاہتے ہیں۔ اب یہ ان کے پڑھنے والوں کا کام ہے کہ اس مقصد سے اتفاق کریں، یا صرف مضحک پہلو اور خالص ظرافت کا مطالبہ کریں!''

(''نشتر و مرہم'' از: رضا نقوی واہی، ص: ۸)

اس مجموعے میں پروفیسر اختر اورینوی نے بھرپور مقدمہ تحریر کیا ہے۔ وہ اپنے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ:

''واہی کی شخصیت اور شاعری میں ہمیں یہ خوبیاں ملتی ہیں۔ ان کی ظریفانہ شاعری میں کہیں پر رکیک اور سوقیانہ پن نہیں ہوتی۔ ان کے یہاں نہ بھونڈہ پن ہے اور نہ کھردرا پن۔ واہؔی کی شاعری میں کسی پہلو سے ناتراشیدگی نہیں ملتی، ان کی نظمیں شائستہ اور مہذب ظرافت کا نمونہ ہیں۔ ان میں نشتریت ضرور پائی جاتی ہے؛ لیکن ساتھ ساتھ وہ زخم پر مرہم بھی لگاتی ہے۔ مختصر یہ کہ واہی کی شاعری قدر اعلیٰ کی چیز ہے''۔

(''نشتر و مرہم'' از: رضا نقوی واہی، ص: ۲۴)

اس مجموعے کے مطالعے کے بعد اختر اورینوی کی اس رائے سے اتفاق لازمی ہے کہ واہی صاحب کا طنزیہ اور ظریفانہ کلام نشتر بھی ہے اور مرہم بھی۔ اس میں جو نظمیں شامل کی گئیں وہ یہ ہیں: ''اسم اعظم''، ''الزام''، ''وفاتی''، ''خدمت ادب''، ''خدام ادب''، ''اقتباساتی ادیب''، ''مکتوبی ادیب''، ''تبصرہ نگاری''، ''یلغار سے انتشار تک''، ''قیام امن''، ''چرچل کی مناجات''، ''اے بھائی مصدق''، ''آباد کاری''، ''ویلفیئر اسٹیٹ''، ''نئے لیڈر کی دعا''، ''ایک اشتہار''، ''الکشن''، ''اپیل''، ''الکشن اور برقعے''، ''دیش بھکت''، ''چال''، ''ہم کون ہیں، ہم کیا ہیں''، ''ایک ہنگامہ پہ موقوف''، ''ترقی''، ''گرومورفوڈ''، ''کھجور''، ''آبادی کا مسئلہ''، ''ہارٹ فیلیور''، ''راشن کی دوکان''، ''ملازمت''، ''رشوت''، ''نگرانی''، ''لیلائے کرپشن''، ''موجد''، ''بلیڈ''، ''معرکہ جہیز و دین مہر''، ''ٹیڈی کفن''، ''مکھن''، ''رکابیہ''، ''کھٹے انگور''، ''ڈکٹیٹر کا سر''، ''نور چشم''، ''افواہ نگار''، ''فلم اسٹار''، ''میر فتنہ''،

''فہرست حماز''، ''مقدر''، ''نیا ہاتھی''، ''طوق زریں''، ''سکندر نامہ'' اور ''قبلہ آپ''۔ اس مجموعے میں بھی گذشتہ مجموعوں کی چند مشہور نظمیں شامل کر لی گئی ہیں۔ ''نور چشم''، ''نیا ہاتھی''، ''اسم اعظم''، ''اقتباساتی ادیب''، ''مکتوبی ادیب''، ''تبصرہ نگاری''، ''یلغار سے انتشار تک''، ''راشن کی دوکان''، ''رشوت''، ''نئے لیڈر کی دعا''، ''خدام ادب''، ''طوق زریں'' وغیرہ اس مجموعے کی خاص نظمیں ہیں۔

رضا نقوی واہی نے آزادی کے بعد ہندوستان کی سیاسی، سماجی زندگی، شعبۂ تعلیم، شعروادب اور تحقیق وتنقید کو خاص طور پر اپنی شاعری کا موضوع بنایا ہے۔ وہ عام طور سے معاشرے کو زوال پذیری کی طرف لے جانے والے افراد کی بے راہ روی کو اپنی طنز وتمسخر کا نشانہ بناتے ہیں۔ ''خدمت ادب''، ''خدام ادب''، ''اقتباساتی ادیب''، ''مکتوبی ادیب''، ''تبصرہ نگاری''، ''یلغار سے انتشار تک''، ''رشوت''، ''نیا ہاتھی''، ''اے بھائی مصدق''، ''نئے لیڈر کی دعا''، ''طوق زریں''، ''کھجور''، ''راشن کی دوکان''، ''بلیڈ''، ''معرکۂ جہیز و دین مہر''، ''لیلائے کرپشن''، ''ٹیڈی کفن'' وغیرہ جیسی نظموں میں شعروادب اور نام نہاد ادیبوں وشاعروں کی بے راہ رویوں کو موضوع سخن بنایا گیا ہے۔ نظم ''خدام ادب'' غالب کے دیوان کی پہلی غزل 'نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا' کی زمین میں قلم بند کی گئی ہے۔ اس میں واہی نے نام نہاد خدام ادب کو ہدف تنقید بنایا ہے۔ یہ نظم ایسے لوگوں کا مضحکہ اڑاتی ہے جو علمی وادبی اعتبار سے کم استعداد ہیں لیکن عالم گیر سطح پر شہرت کے متمنی ہوتے ہیں۔ واہی ایسے فریب کاروں کی ہمیشہ مخالفت کرتے رہے۔ وہ ادب اور ادیب کے معاملے میں بھی اعتدال پسندی کے قائل تھے:

اک طرف اردو کی قسمت روکش وشام ہے   یعنی اس کو ختم کردینے کی سازش عام ہے
دوسری جانب جدھر بھی آج اٹھتی ہے نگاہ   تال سر کے اسلحوں سے لیس ہے اس کی سپاہ
ہر طرف سے اٹھ رہا ہے شور دار و گیر کا   کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

''تبصرہ نگاری'' میں ایسے مبصر کا خاکہ اڑایا گیا ہے، جو ہر طرح کی کتابوں پر فی البدیہہ تبصرے لکھتے ہیں۔ اس فن میں موجودہ دور کے مبصرین اتنی مہارت رکھتے ہیں کہ کتابوں کو پڑھے بغیر ہی تبصرہ کر دیتے ہیں۔ ''وفاتی'' میں ایک ایسے شاعر کا ذکر ہے، جو تاریخ وفات نکالنے کے لیے قطعات لکھنے میں ماہر تھے اور اموات کے منتظر رہا کرتے تھے۔ ''یلغار سے انتشار تک'' میں ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے غیر متوازن رجحانات کو نشانۂ طنز بنایا گیا ہے۔

واہی نے عصر حاضر کے سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل پر بھی خامہ فرسائی کی ہے، وہ ہماری

معاشرتی زندگی میں بحران پیدا کرنے والے مسائل پر شدید طنز کرتے ہیں؛ تاکہ لوگوں کا ذہن اصلاح کی طرف مائل ہو۔ ''معرکۂ جہیز و دین مہر'' میں جہیز اور فرمائشات کی لعنت کی مذمت کی گئی ہے۔ واہی نے اس میں ایک فرضی واقعہ کے توسط سے حالات حاضرہ کی حقیقی عکاسی کی ہے۔ نظم کے آخری دو شعر پیش ہیں، جس میں نہ صرف موجودہ روش پر مزاحیہ پیرائے میں بھرپور طنز ہے؛ بلکہ یہ اس گھناؤنی روش سے اجتناب کا پیغام بھی دیتا ہے:

جب سے سنا ہے ہم نے یہ سنگین واقعہ   اولاد والوں کو یہی دیتے ہیں مشورہ
نور نظر کو مال تجارت بنائیے   لیکن زبان پہ نام شریعت نہ لائیے

نظم ''رشوت'' میں رشوت خوری کی بڑھتی ہوئی لعنت کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے۔ عصر حاضر میں رشوت کی جو کرشمہ سازی ہے، اس پر سے واہی یوں پردہ اٹھاتے ہیں:

قاتل کو بچا لیتی ہے پھانسی کی سزا سے   اللہ کی رحمت ہے یہ اللہ کی رحمت
انصاف کا پلہ یہ جدھر چاہے جھکا لے   مٹھی میں لیے رہتی ہے میزان عدالت
اعجاز ہے اعجاز ہے رشوت کا اشارہ   اللہ رے اللہ رے رشوت کی کرامت
سونے کا کلس مسجد جامع پر چڑھے گا   سنتے ہیں کہ ایک سیٹھ نے مانی ہے یہ منت
یہ سچ ہے کہ رشوت کی رسائی ہے وہاں تک   یہ سچ ہے تو اللہ بھی ہے بندۂ رشوت

اس نظم میں بظاہر رشوت کی ستائش کی گئی ہے؛ لیکن بہ باطن اس میں رشوت خوری پر جو گہرا طنز پوشیدہ ہے، وہ واہی کی فنکاری کی عمدہ مثال ہے۔ شگفتہ مزاح کے پس پشت اس میں جو بھرپور طنز موجود ہے، وہ ذہن کو متاثر کرتا ہے۔ ''طوق زریں'' میں معاشرہ کی ذہنی پستی اور ''کھجور'' میں ملک کے غریبوں کے ساتھ اپنی اور اغیار کی ہمدردی کا نقشہ پر لطف انداز میں کھینچا گیا ہے۔ ''راشن کی دوکان'' میں گرانی اور عوام کی پریشان حالی کی نقش گری ملتی ہے۔ ''بلیڈ'' میں تاجروں کی منافع خوری کی حقیقی تصویرکشی ہے۔ ''لیلائے کرپشن'' میں سرکاری دفاتر میں عام ہوئی رشوت خوری کے رجحان کی عمدہ مصوری نظر آتی ہے۔ ''ٹیڈی کفن'' میں نئی تہذیب کی مضحکہ خیز وضع داری کا پردہ فاش کیا گیا ہے۔

واہی نے ملکی سیاست اور لیڈران کی بے اعتدالیوں اور بدعنوانیوں کا بھی پردہ فاش کیا ہے۔ ''الکشن''، ''الکشن اور برقعے''، ''نیا ہاتھی''، ''دیش بھگت''، ''ڈکٹیٹر کا سر''، ''ایک اشتہار''، ''اپیل''، ''نئے لیڈر کی دعا'' جیسی نظمیں عصری سیاست کی آئینہ داری کرتی ہیں۔ آج کی گندی سیاست کے طفیل

ہمارے لیڈران میں جو حرص و ہوس، خود غرضی، مکاری، ریا کاری، فریب کاری، بے غیرتی، منافقت اور لوٹ کھسوٹ کا جذبہ حاوی ہو گیا ہے کہ اب ہر نیا لیڈر اپنے لیے یہ دعا کرتا نظر آتا ہے کہ!

بھگوان مرے دل کو وہ زندہ تمنا دے	جو حرص کو بھڑکا دے اور جیب کو گرما دے
وادیٔ سیاست کے اس ذرے کو چمکا دے	اس خادم ادنیٰ کو اک کرسیٔ اعلیٰ دے
اوروں کا جو حصہ ہے مجھ کو وہی داتا دے	محروم بتاشہ ہوں تو پوری و حلوہ دے
ہاں مرغ مسلم دے، ہاں گرم پراٹھا دے	سوکھی ہوئی آنتوں کو فوراً ہی جو چکنا دے
تحریر میں چستی دے، تقریر میں گرمی دے	جنتا کو جو پھسلا لے اور قوم کو بہکا دے
کرسیٔ وزارت پر اک جست میں چڑھ جاؤں	تدبیر کو پھرتی دے تقدیر کو جھٹکا دے

''نیا ہاتھی'' میں عصر حاضر کے لیڈران پر بھرپور طنز ہے۔ یہ ایسے سیاسی رہنماؤں کے انداز عمل کا اشاریہ ہے جن کی بدولت جلسوں اور محفلوں کی مصنوعی رونق بڑھتی اور بڑھائی جاتی ہے۔ آج کے لیڈران کو شاعر نے نئے ہاتھی سے تعبیر کیا ہے۔ ان کی جیتی جاگتی تصویر ملاحظہ ہو:

شادیاں ہوتی تھیں پہلے جب کسی دیہات میں	چند ہاتھی بھی منگائے جاتے تھے بارات میں
اور اب ان کے عوض ہر گاؤں میں دیہات میں	ناخدایان سیاست جاتے ہیں بارات میں
ایک ہاتھی پر جو پہلے خرچ ہوتی تھی رقم	ایک نیتا پر وہی ہوتی ہے صرف اب بیش و کم

''اے بھائی مصدق'' مستزاد کی تکنیک میں لکھی گئی خوبصورت نظم ہے۔ اس کا ایک بند ملاحظہ ہو:

انگریز کو کس شان سے انگلی پر نچایا	اے بھائی مصدق
واللہ بڑا لطف ہمیں دیکھ کر آیا	اے بھائی مصدق
عاشق کے جنازے کو تکلف سے نکالا	تھا ڈھنگ نرالا
خود غسل دیا خود ہی کفن اس کو پہنایا	اے بھائی مصدق

واقعتاً ''نشتر و مرہم'' کے مشتملات قارئین کے ذہن و دل پر نشتر بھی چبھوتے ہیں اور پھر اس پر مرہم بھی لگاتے ہیں۔ بلاشبہ یہ اردو کی طنزیہ اور ظریفانہ نظموں کا ایک گراں قدر مجموعہ ہے۔

واہی کے کلام کا چوتھا مجموعہ ''کلام نرم و نازک'' اردو کی طنزیہ اور ظریفانہ نظموں کا ایک گراں قدر مجموعہ ہے، اس کے مرتب ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی ہیں۔ انہوں نے ''عرض مرتب'' کے عنوان

سے چند جملوں میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس مجموعے میں ۸۸ نظمیں شامل ہیں، جن کے عنوانات ہیں: ''غالب صدی اور اردو''، ''تحریک شعرستان''، ''تشکیل شعرستان کے بعد''، ''شعرستان سے ایک خط''، ''شعرستان میں شاعروں کے خاندان''، ''شعرستان میں دستور سازی کی کوشش''، ''شعرستان کی نئی نسل''، ''چاند اور شاعر''، ''چاند اور محبوب''، ''چور دروازہ''، ''مرغ بانی''، ''تحسین جدید''، ''پروگرام واہی''، ''بڑا صاحب''، ''شاعر''، ''ملا''، ''ایڈیٹر''، ''پلیڈر''، ''لیڈر''، ''پروفیسر''، ''نقاد''، ''فلسفی''، ''محقق''، ''نقاد''، ''پی ایچ ڈی''، ''انتقال کے بعد''، ''انٹلکچوئل''، ''مشاعرہ اور کامریڈ''، ''گویا شاعر''، ''ریل کا سفر''، ''انٹرویو''، ''میں اسٹوڈنٹ ہوں''، ''اسٹوڈنٹ''، ''اے میری زیر پائی''، ''شکوہ اللہ سے''، ''یلغار سے انتشار تک''، ''ماسٹر پلان''، ''وفاتی''، ''خدمت ادب''، ''خدام ادب''، ''اقتباساتی ادیب''، ''مکتوبی ادیب''، ''تبصرہ نگاری''، ''ایک اشتہار''، ''اپیل''، ''نئے لیڈر کی دعا''، ''فہرست حمار''، ''پروفیسر نامہ''، ''حضرت کاتب''، ''عرض کاتب''، ''جنرل اسپتال''، ''لال فیتہ''، ''ترقی''، ''راشن کی دکان''، ''رشوت''، ''بلیڈ''، ''ٹیڈی کفن''، ''مکھن''، ''ڈکٹیٹر کا سر''، ''معرکہ جہیز و دین مہر''، ''رکابیہ''، ''مشاعرہ سے پہلے اور بعد''، ''رسائل میں چھپنے کی ترکیب''، ''لیڈری کا نسخہ''، ''ماہر فن''، ''اے لکچرر''، ''نیا ہاتھی''، ''ہم نے چاہا تھا''، ''ملازمت''، ''گھریلو منصوبہ''، ''الزام''، ''اسم اعظم''، ''لیلائے کرپشن''، ''مقدر''، ''زبان''، ''افواہ نگار''، ''رسائل مفت حاصل کرنے کی ترکیب''، ''ایڈیٹر کا دردسر''، ''گرومورفوڈ''، ''پیروی''، ''سلامی''، ''نور چشم''، ''شاعر بسیار گو''، ''آئینہ''، ''مچھروں کا گیت''، ''اللہ رے مادہ''، ''آزادی''، ''انہماک''، ''ٹیڈی بوائے''، ''ٹیڈی گرل''، ''بلیک مارکٹ''، ''مشاعرہ''، ''شہرت اضافی''، ''لفافے'' اور ''الکشن''۔ اس مجموعے میں ہرگانوی صاحب نے ''واہیات'' ''طنز و تبسم'' اور ''نشتر و مرہم'' کی چند منتخب نظمیں بھی شامل کر لی ہیں۔ شعرستان سلسلے کی نظموں کے علاوہ، اس میں واہی کے چند منظوم خطوط خلیل الرحمٰن اعظمی، ڈاکٹر سید محمد عقیل، مجتبیٰ حسین، اختر قادری، جگن ناتھ آزاد، رؤف خلش، مصطفیٰ کمال، گوپال متل، بہاء الدین احمد کلیم، مظفر حنفی، وفا ملک پوری، پروفیسر عبدالمغنی، شاہین غازی پوری، خالد رحیم اور سنتوکھ سنگھ معصوم جیسے مخلص احباب کے نام شامل ہیں۔

زیر نظر مجموعے کے مشتملات بھی متنوع ہیں۔ اس میں سماجی، سیاسی، تہذیبی، ادبی اور تعلیمی و تدریسی موضوعات پر نظمیں موجود ہیں۔ ''آئینہ'' نہایت دلچسپ اور فکر انگیز نظم ہے جس میں ملا کے قول

وفعل کے تضاد اور منافقت کو دلچسپ پیرائے میں آشکار کیا گیا ہے۔ ملا صاحب نے ایک تقریر کے دوران انفاق فی سبیل اللہ کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے فرمایا کہ جو شخص ساٹھ مساکین کو کھانا کھلائے گا، وہ اس کا انعام جنت کی شکل میں پائے گا۔ اتفاق سے اس مجلس میں واعظ محترم کی بیگم بھی موجود تھیں۔ انہوں نے بھی جنت کے حصول کی لالچ میں اپنے گھر پر ساٹھ مساکین کی دعوت کا اہتمام کر ڈالا۔ حضرت واعظ کو جب اس کا پتہ چلا تو وہ بالکل طیش میں آ گئے اور اپنی بیگم صاحبہ کو جو لعن طعن سنائی، اسے ملاحظہ فرمائیے:

بولے سر پیٹ کے ملا کہ خدا کی لعنت — تجھ سی عورت کا تو ہے قصر جہنم میں مقام
اپنا گھر پھونک کے جنت میں بناتی ہے مکان — کیا یہی حکم شریعت ہے ارے نافرمان
تو مرے وعظ کا کیا خاک سمجھتی مطلب — تو ہے شیطان کی خالہ، وہ خدا کا ہے پیام
فرض بندوں کا شریعت پہ عمل کرنا ہے — ہم سے اللہ کے پیاروں کا فقط وعظ ہے کام

نظم ''ماسٹر پلان'' میں حکومت کے پنج سالہ منصوبے اور اس میں ہونے والی کاغذی خانہ پری کا جس طرح تمسخر اڑایا گیا ہے اور عوام کی ترقی پذیر خستہ حالی کی حقیقت پسندانہ عکاسی کی گئی ہے، وہ دیدنی ہے۔ محض چھ اشعار پر مشتمل اس جامع نظم میں واہیؔ نے جس فنکارانہ اور واقعیت شعارانہ انداز میں ماسٹر پلان کا تجزیہ و محاکمہ کیا ہے، وہ ان کی تخلیقی مہارت پر دال ہے۔ اس نظم کے آخری شعر کو منصوبہ بندی کے نتائج کا نچوڑ کہا جائے تو غلط بھی نہ ہوگا۔ شعر پڑھیے اور لطف اٹھائیے:

سندری کے کارخانہ میں ختم پلان تک — تیار ہوگی کھاد مرے استخوان کی

''جنرل اسپتال'' میں سرکاری اسپتالوں کی حالت زار اور مریضوں کے تئیں ڈاکٹروں، کمپاؤنڈروں اور نرسوں کی بے حسی اور بے نیازی کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے:

ہمارے شہر میں ہیں چند خاص خاص مقام — انہی میں آتا ہے اک جنرل اسپتال کا نام
معالجوں کی تجارت کا یہ شیئر بازار — جہاں مریض کی ہوتی ہے زندگی نیلام
بلیک مارکیٹنگ اس جگہ نہیں ہوتی — خریدتے ہیں یہاں لوگ موت سستے دام
کوئی غریب جو اس جال میں پھنسا تو گیا — طلسم ہوش ربا سے نہیں ہے کم یہ مقام
ہر ایک نرس یہاں موت کی سہیلی ہے — بڑے خلوص سے کرتی ہے اس کا سارا کام

''ماہر فن'' میں موجودہ ڈاکٹروں کی تعلیم و تربیت، ان کی نااہلی اور ناتجربہ کاری کی نقاب کشائی کی گئی ہے۔ آج کے یہ ڈاکٹر مریض کی راحت رسانی کے بجائے اسے مزید تکلیف پہنچانے کا

سبب بن جاتے ہیں۔ ایک مریض نچلے مسوڑھے کی درد سے نجات پانے کی خاطر ڈاکٹر کے پاس پہنچا اور ڈاکٹر کے مشورے سے دانت اکھڑوانے کی ہمت بھی دکھائی؛ لیکن ماہر فن صاحب انجکشن لگا کر نچلے دانت کے بجائے اوپر کا دانت نکال دیتے ہیں۔ ''ٹیڈی کفن'' میں مغرب زدگی کے تحت چست لباس زیب تن کرنے کے فیشن کا مضحکہ اڑایا گیا ہے۔ ''اے میری زیر پائی'' شاعر کی خستہ حال چپل کا نوحہ ہے۔ اسے پڑھ کر پرویز شاہدی کی نظم ''شیروانی'' کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔

ملک کی آزادی اور جمہوری نظام حکومت کی تشکیل کے وقت عوام نے جو حسین خواب دیکھا تھا وہ بالکل چکنا چور ہو کر رہ گیا۔ کیوں کہ ہمارے قومی رہنماؤں نے خدمت خلق اور جذبۂ ایثار کا مظاہرہ نہیں کیا بلکہ وہ تو صرف حرص و ہوس، لوٹ کھسوٹ، رشوت ستانی، اقربا پروری، نفس پرستی اور اقتدار کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر رہ گئے۔ ''لیڈر''، ''لیڈری کا نسخہ''، ''نئے لیڈر کی دعا''، ''الکشن''، ''ڈکٹیٹر کا سر''، ''اپیل'' اور ''ایک اشتہار'' میں موجودہ نظام سیاست کی عمدہ اور حقیقی عکاسی کی گئی ہے۔

''غالب اور اردو'' میں حکومت کے مالی تعاون سے منعقدہ غالب تقریبات کے پس منظر میں اردو کی بے بسی اور خستہ حالی کا شکوہ کیا گیا ہے۔ ''انٹلکچوئل'' میں ہوٹلوں میں بیٹھنے والے نیم تعلیم یافتہ نام نہاد دانشوران کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ ''چاند اور شاعر'' میں چاند کی تسخیر کے بعد کے حالات کی واقعیت شعارانہ عکاسی ملتی ہے۔ ''چاند اور محبوب'' میں شاعر نے چاند سے متعلق ان جدید انکشافات کو روشن کرنے کی سعی کی ہے جنہوں نے چاند سے متعلق محبوب و قدیم تصور کو مسخ کر کے رکھ دیا ہے۔ ''تحسین جدید'' میں جدیدیت کی فیشن پرستی کو ہدف طنز بنایا گیا ہے۔ ''اے لکچرر'' میں موجودہ دور کے استاد کی صلاحیت اور اہلیت کی عمدہ مصوری کی گئی ہے۔ ''حضرت کاتب'' سے وہی قاری لطف اندوز ہو سکتا ہے، جو طباعت و اشاعت کے تکنیکی مراحل کی کلی واقفیت رکھتا ہو۔ غرض کہ ''کلام نرم و نازک'' ایک وقیع مجموعہ ہے، جس میں سماجی، سیاسی، تہذیبی اور ادبی ہر نوع کے موضوع پر نظمیں مل جاتی ہیں۔

''نام بہ نام'' رضا نقوی واہیؔ کے منظوم خطوط کا ایک دلکش مجموعہ ہے، جسے ۱۹۷۴ء میں پریم گوپال متل نے مرتب کر کے اپنے اشاعتی ادارے پی کے پبلی کیشنز، دہلی کے زیر اہتمام زیور طبع سے آراستہ کیا۔ واہیؔ نے طنزیہ و مزاحیہ اور پیروڈی نظم کے علاوہ مزاحیہ منظوم خطوط بھی لکھے ہیں، جو ان کے چند شعری مجموعوں اور ''نام بہ نام'' میں شامل ہیں۔ منظوم خطوط نگاری کے میدان میں بھی ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آتا۔ زیر نظر مجموعے میں جن ہم عصر ادیبوں، شاعروں اور دوستوں کے نام منظوم

خطوط شامل ہیں، وہ ہیں: امیر رضا کاظمی، علقمہ شبلی، اختر قادری، جگن ناتھ آزاد، لطف الرحمٰن، سید فیضان احمد، مصطفےٰ کمال، مجتبیٰ حسین، رؤف خلش، ڈاکٹر سید محمد عقیل، خلیل الرحمٰن اعظمی، گوپال متل ،مظفر حنفی، وفا ملک پوری، عبدالمغنی، خالد رحیم، سنتوکھ سنگھ معصوم، پرکاش فکری، کرامت علی کرامت، جاوید شہبازی، شمائل نبی، سلطان اختر، سلمیٰ جاوید، اسلم آزاد، حکیم غبار بھٹی، شہزاد معصومی اور بہاء الدین احمد کلیم۔ انہوں نے ان احباب کو اپنے تعلقات کی بنا پر جو منظوم خطوط لکھے ہیں، ان میں بھی طنز و مزاح کے اعلیٰ نمونے اور بعض برائیوں کی طرف لطیف اشارے ملتے ہیں۔ واہی نے اپنے منظوم خطوط میں بھی ہنسی اور مسکراہٹ کے خوب مواقع پیدا کیے ہیں۔ ان کے منظوم خطوط کا وافر حصہ آج بھی بعض رسالوں اور دوستوں کی فائلوں میں گم ہے۔ زیر نظر مجموعے میں واہی کے ۳۳ر منظوم خطوط شامل ہیں، جن میں نہایت فنکارانہ صناعی سے ظریفانہ پیرائے میں اس دور کے حالات وکوائف اور نفسیات کے علاوہ سیاسی، سماجی، معاشی، ادبی اور اخلاقی صورت حال کی عکاسی کی گئی ہے۔ مجموعے کے آغاز میں مخمور سعیدی نے اپنے ''حرفے چند'' میں بجا فرمایا ہے کہ!

''قدرتی طور پر ان میں طنز سے زیادہ مزاح کی چاشنی ہے اور یہ ان کے باقی کلام سے کچھ مختلف ذائقہ رکھتے ہیں۔ بے تکلف دوستوں اور قریبی عزیزوں سے تخاطب کے مواقع، ذہنی شگفتگی کے جن خوبصورت لمحوں کی تخلیق کرتے ہیں، یہ خطوط ان ہی لمحوں میں موزوں ہوئے ہیں اور اسی لیے ان میں مسرت انگیزی اور مسرت اندوزی کی دو متوازی لہریں شروع سے آخر تک جاری وساری نظر آتی ہیں۔ اکثر خطوط میں موجودہ ادبی صورت حال کی طرف بھی اشارے کئے گئے ہیں۔ یہ واضح اشارے نہ صرف یہ کہ شعر وادب کی موجودہ سمت ورفتار سے شاعر کی باخبری کے آئینہ دار ہیں؛ بلکہ اس کی مخصوص تنقیدی بصیرت کو بھی سامنے لاتے ہیں۔ ہنسی ہنسی میں پتے کی بات کہہ جانے کا یہ سلیقہ خصوصیت سے داد طلب ہے۔

ان منظوم خطوط کی مخاطب اکثر معروف شخصیتیں ہیں، جن دوسری شخصیتوں کا ان میں ذکر آیا ہے، وہ بھی جانی پہچانی ہیں اور ادب کا سنجیدہ قاری ان میں سے اکثر کے خط و خال سے بخوبی آشنا ہیں۔ ان منظوم خطوط کے آئینے میں اسے ان کے یہ مانوس خط وخال تو نظر آئیں گے ہی؛ لیکن کچھ ایسے گوشوں سے بھی وہ نقاب اٹھتی دیکھے گا، جو اس کے لیے نادیدہ ہوں گے۔ اس طرح وہ ان خطوط کے مطالعے سے دوگونہ لطف اٹھا سکے گا''۔

بلا شبہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کے نام لکھے گئے واہی کے فی البدیہہ منظوم خطوط کے مطالعے سے ان کی بے تکلفی، برجستگی، شوخی اور قادر الکلامی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ واہی کے یہ منظوم خطوط اردو کی ظریفانہ شاعری کا ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔ ان میں کچھ ایسے یادگار لمحات بھی محفوظ ہو گئے ہیں، جو ہمیں ان کے ادب نواز دوستوں اور عزیزوں کی ملاقاتوں کی یادیں تازہ کر دیتے ہیں۔ انہوں نے ان خطوط میں مطایبات کے پردے میں بعض لوگوں کو نصیحت بھی کی ہے۔ واہی کا کمال یہ ہے کہ جب وہ کسی انسان میں کوئی کمی، یا کمزوری کو محسوس کرتے ہیں تو اس کا بے لاگ اظہار کرتے ہیں؛ لیکن اس دلچسپ انداز میں کہ یہ کسی کی دل آزاری کا سبب نہیں بنتا ہے۔ ان کی شوخی و برجستگی انہیں اپنے مقصدیت سے بہت حد تک ہم کنار کر دیتی ہے۔ واہی کے منظوم خطوط اپنے عمدہ طرز اظہار اور شوخیٔ بیان کے سبب قاری کے دل کو چھوتے اور بھاتے ہیں۔ واہی کے یہ خطوط ان کے مخصوص طنزیہ وظریفانہ لب ولہجہ کے حامل ہیں۔ تفریح طبع کے طور پر ان کے چند خطوط کے اشعار پیش ہیں۔ پہلے اختر قادری کے نام لکھے گئے اوّلین خط کے یہ چار اشعار ملاحظہ ہوں:

بھائی اختر قادری واللہ تم بھی خوب ہو   ہے طبیعت میں کبھی خشکی کبھی مرطوب ہو
ہے کبھی لطف و عنایت اور کبھی پیہم ستم   اپنے رنگ دلبری میں صاحب اسلوب ہو
تم میں کب سے آ گئی ہے یہ قلوپطرائیت   یعنی جو چاہے تمہیں وہ لازماً معتوب ہو
کیوں نہ تم سے ہجو یہ انداز میں باتیں کروں   'ڈسٹ بن'' کی نذر جب میرا ہر اک مکتوب ہو

ان کے نام لکھے گئے دوسرے خط کے اشعار میں بھی ظریفانہ چاشنی کچھ کم نہیں، جو یقیناً قاری کے غنچۂ دل کو تازگی وشگفتگی بخشتی ہے۔ اس خط سے چند اشعار پیش ہیں:

ہاتھ میں مہندی لگائے منھ میں ڈالے گھنگھنیاں   کب تک اس انداز سے بیٹھے رہو گے میری جاں
چاہنے والے کو خط لکھنے میں شرماتے ہو کیا   یا قلم کے بوجھ سے دُکھتی ہیں نازک انگلیاں
تم نے اک وعدہ خلافی کی تو اس سے کیا ہوا   وہ تو ہے منجملۂ ناز و ادائے دلبراں

اسلم آزاد کو لکھے گئے خط میں جدید غزل گوئیوں کی الٹرا ماڈرن فنی اور ذہنی رویے پر اچھوتے انداز میں طنز کیا گیا ہے، اس میں جو مزاح ہے، وہ بے حد لطیف ہے۔ کہیں کہیں طنز کا عنصر بھی غالب ہے، اس میں جو بے ساختگی اور لطافت ہے، وہ قابل داد ہے۔ جگن ناتھ آزاد کے نام منظوم خط کا یہ دلچسپ آخری ٹکڑا دیکھئے:

نظم آزاد میں خط لکھنا ہے کتنا آساں
آج معلوم ہوا
شعرا میں ہوئی یہ جنس سخن کیوں ارزاں
آج معلوم ہوا
والسلام
آپ کا اپنا واہی

یہاں واہی نے فیشن زدہ جدیدیت پر طنز کے تیر چلائے ہیں، انہوں نے جس انداز میں اپنے دوستوں اور عزیزوں سے چھیڑ چھاڑ کی ہے، وہ بے حد پر لطف ہے۔ ڈاکٹر سید محمد عقیل کے نام اپنا خط وہ یوں شروع کرتے ہیں:

مدت سے کیوں خموش ہیں اے حضرت عقیل
کیوں آج کل ہے خط و کتابت میں اتنی ڈھیل

واہی خوب ڈھونڈ ڈھانڈ کر قافیہ نکالتے ہیں۔ انہوں نے یہاں جو ڈھیل کا قافیہ استعمال کیا ہے، وہ داد طلب ہے۔ رضا نقوی واہی نے اپنے منظوم خطوط میں خیریت مطلوب ہے اور دیگر احوال یہ ہے کہ وغیرہ لکھنے کی ابتدا کی۔ واہی صاحب منظوم خطوط لکھنے میں بھی مہارت رکھتے ہیں، وہ کسی بھی قسم کے حادثہ، واقعہ، یا نکتہ میں بھی طنز و مزاح کا پہلو نکال لیتے ہیں۔ ان کے ایک دوست سنتو کھ سنگھ معصوم کے گھر پر کچھ چوروں نے حملہ کر کے انہیں زخمی کر دیا۔ واہی تک جب یہ خبر پہنچی تو انہوں نے سردار سنتو کھ سنگھ معصوم کو لکھا کہ!

چوروں سے معرکے کا پڑھا خط میں حال جی	واللہ آپ نے تو دکھایا کمال جی
کچھ مل سکا نہ ہوگا بجز نظم اور غزل	ہوگا اسی لیے انہیں بے حد ملال جی
رحمت گرو کی ڈھال بنی آپ کے لیے	اس واسطے نہ گل سکی چوروں کی دال جی
کیسی ہے اور کہاں پہ نواسی ہے آجکل	ہے نانیہال میں کہ گئی دادیہال جی
بچوں کو پیار کیجئے میری دعا کے ساتھ	سردارنی سے کہئے سرست اکال جی

رضا نقوی واہی اپنے منظوم خطوط میں فنکارانہ مہارت سے ایجاز و اختصار کے ساتھ نادیدہ گوشوں کی نشاندہی بھی خوب کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر اسلم آزاد کو لکھے گئے خط کا یہ ٹکڑا دیکھئے:

خط ملا آپ کا اسلم صاحب	خوش ہوئے پا کے اسے ہم صاحب
آپ کے ہاتھ کی مہندی چھوٹی	یہ خبر نہیں کچھ کم صاحب
آپ کے عشق مزاجی کی لو	تیز ہے یا کہ ہے مدھم صاحب
شغل جاری ہے نظر بازی کا	یا کہ یہ شوق ہوا کم صاحب
گاؤں کی اور کسی لڑکی سے	ہو سکا یا نہیں سنگم صاحب
ایک دوشیزہ براہ الفت	چاہئے آپ کو ہر دم صاحب
آج کل وقت گزاری کے لیے	کس سے خوش کس سے ہیں برہم صاحب

اس خط میں ہر شعر اپنی جگہ مکمل ہونے کے باوجود دوسرے کی تکمیل کرتا ہے اور ''صاحب'' کی ردیف اس عمل میں از حد معاون ہے۔ گوپال متل کے نام تحریر کردہ خط میں واہی جس ظریفانہ انداز میں ''صحرا میں اذاں'' کا ذکر کرتے ہوئے عدم خیر و عافیت کا شکوہ کرتے ہیں، وہ نہ صرف ان کی حاضر دماغی و شوخ مزاجی پر دال ہے؛ بلکہ اس فن میں ان کی مہارت کا بھی آئینہ دار ہے۔ واہی یہاں گوپال متل کی تصنیف ''صحرا میں اذاں'' سے کس طرح کا علامتی فائدہ اٹھاتے ہیں، دیکھئے:

اے حضرت متل یہ کرم ہے کہ ستم ہے	کیوں لطف نظر آپ کا ناچیز پہ کم ہے
واللہ کے ہیں آپ بھی اک زندہ عجائب	صحرا میں اذاں دے کے کہاں ہو گئے غائب
مانا کہ مرے شہر سے دلی ہے بہت دور	جیسے کہ رہے رسم وفا سے دل مخمور

معروف اردو روزنامہ ''قومی آواز''، لکھنؤ کے ایک شمارہ میں پاکستان کے مشہور طنزیہ و مزاحیہ شاعر دلاور فگار کی نظم ''ہند کو پھر ڈاک بھیجئے'' شائع ہوئی تو اسے پڑھ کر واہی نے جواب میں دلاور فگار کو ''شوق سے پھر ڈاک بھیجئے'' کے عنوان سے منظوم خط ارسال کیا۔ اس میں انہوں نے لکھا کہ آپ شوق سے ڈاک اور مزاح کا اسٹاک بھیجئے۔ یہاں ہندوستان میں نرس اور ڈاکٹروں نے ہڑتال کر رکھی ہے، لہٰذا اس وقت سینۂ صد چاک نہ بھیجئے گا۔ احباب کے تحفوں کا کیا کہنا، خواہ وہ گوبھی کے پھول ہوں، یا ڈھاک، سب قبول ہیں۔ گلے بازوں اور مترنم شاعروں کو نشانۂ طنز بناتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بیگل کو اب مکیش کی دھن پسند نہیں، لہٰذا آپ اپنے یہاں سے مقبول گلوکار مہدی حسن کا کچھ اسٹاک روانہ کیجئے اور ان سب کے علاوہ لکھنے پڑھنے والوں، شاعروں، ادیبوں کی بہترین ذہنی و روحانی غذا اخبارات، رسائل و جرائد اور کتابیں جہاں تک ممکن ہو سکے، ضرور بھیجئے؛ اس لیے کہ یہ نعمت غیر مترقبہ سے کم نہیں

ہوگا۔ واہیؔ اپنی ان فرمائشات وجذبات کو کس طرح اشعار میں پروتے ہیں، دیکھئے:

بھائی فگار شوق سے پھر ڈاک بھیجئے
جی کھول کے مزاح کا اسٹاک بھیجئے

ہڑتال کر رہے ہیں یہاں نرس و ڈاکٹر
ہرگز ابھی نہ سینۂ صد چاک بھیجئے

ہر تحفۂ خلوص ہمیں دل سے ہے قبول
گوبھی کے پھول بھیجئے یا ڈھاک بھیجئے

آزادؔ اور سحرؔ کی جو خاطر عزیز ہے
ارض چمن سے ان کے لیے تاک بھیجئے

بیکل کو اب پسند نہیں دھن مکیش کی
مہندی حسن کے گانوں کا اسٹاک بھیجئے

اک وفد شاعروں کا قیادت میں فیضؔ کی
سردار جعفری سے پئے ٹاک بھیجئے

فاروقی و عمیق سے کھا جائے گا وہ مات
نقاد ادھر سے لاکھ خطرناک بھیجئے

ساتھ اپنے کچھ مزاح نگاروں کو لائیے
چھت توڑ قہقہے سوئے افلاک بھیجئے

آنکھیں ترس رہی ہیں رسالوں کی دید کو
ارباب ذوق کے لیے خوراک بھیجئے

یعنی نقوش و ساقی و اوراق و سیپ کو
بوروں میں بھر کے تھاک پس تھاک بھیجئے

واہی کی دست بستہ گزارش ہے آپ سے
ادراک کے جواب میں ادراک بھیجئے

جب دوستی کا ہاتھ بڑھا ہے تو اب نہ پھر
اس پیش رفت کو سوئے ڈیڈ لاک بھیجئے

اس خط میں واہی نے نزاکت و برجستگی اور ظرافت کا ایسا رنگ گھولا کہ جہاں لوگوں کی اس قسم کی مزاحیہ منظومات میں دلچسپی بڑھی، وہیں اس زمانے کے مشہور و مقبول قلم کاروں کی یادیں تازہ کرنے کی سبیل بھی پیدا ہوئی۔ واضح رہے کہ واہیؔ نے یہ خط اس وقت تحریر کیا تھا؛ جب ملک کی سرحدوں کے درمیان مفاہمیت کی راہیں ہموار ہو چلی تھیں اور ڈاک وترسیل سے پابندی بھی ختم ہو چکی تھی۔ مصطفٰے کمال، مدیر ''شگوفہ'' حیدر آباد کے نام لکھے گئے طویل منظوم خط بھی واہیؔ کی زبردست خلاقانہ صلاحیت کا غماز ہے۔ اس خط سے چند اشعار پیش ہیں:

آج کی ڈاک سے خط آپ کا آیا صاحب
شکریہ اس نگہ لطف و کرم کا صاحب

ہے خوشی اس کی کہ اب ہاتھ کی مہندی چھوٹی
دیکھ کر کارڈ مگر شک ہے یہ پیدا صاحب

یہ بھی ممکن ہے تساہل نے اجازت ہی نہ دی
اس لیے آپ نے اک کارڈ ہی لکھا صاحب

خیر ہر حال میں راضی بہ رضا رہنا ہے
آپ جس طرح سے پیش آئیں ہے اچھا صاحب

یہ تو فرمایئے وہ زخم بھرا یا کہ نہیں
کھا کے کشمیر سے جو آئے تھے چرکا صاحب

طاق سے جفت ہوئے یا کہ لنڈورے ہیں ابھی
کیوں کوئی اور نیا زخم لگا کیا صاحب

حال پٹنہ کا وہی ہے کہ ہمیشہ سے جو تھا
وہی چولی وہی ساری وہی لہنگا صاحب

چند اک ماہ سے سانجر کی شکایت ہے مجھے
وقت بے وقت جو کر دیتا ہے حملہ صاحب

صبح سے آج بھی اعضا شکنی ہے کچھ کچھ
عین ممکن ہے مرض بول دے دھاوا صاحب

اور تو کوئی نئی بات نہیں لکھنے کی
اور تو کوئی خبر ہی نہیں تازہ صاحب

واہی کے منظوم خطوط کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ بعض پستہ قد لوگوں نے ان سے خوشامد اور چاپلوسی کر کے اپنے نام منظوم خطوط لکھوا کے کچھ کچھ مشہور ہو گئے۔ ''نام بہ نام'' میں بھی واہیؔ کا شاعرانہ کمال کھل کر سامنے آیا ہے۔ انہوں نے جو قلم برداشتہ و بے ساختہ منظوم خطوط لکھے، ان میں بھی کم وبیش وہی حسن وخوبی موجود ہے، جو غالب کے خطوط کی خاص پہچان ہے۔ واہیؔ کے مزاحیہ منظوم خطوط میں وہ اثر وخوبیاں ہیں، جنہیں پڑھ کر قاری کا ذہن خود بہ خود غالب کی سہل بیانی اور شگفتگی کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ واہیؔ کا منفرد طنزیہ ومزاحیہ انداز، ان کے بے تکلف منظوم خطوط میں بھی جھلکتا ہے۔ یہ خطوط ان کی شاعرانہ مہارت اور ان کے فکر کی بلندی کو ظاہر کرتے ہیں۔ واہیؔ کے منظوم خطوط محض شاعری کی قبا پہنے ہوئے نہیں ہیں؛ بلکہ ان کے خطوط شاعرانہ معیار کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے تمام تر منظر نامے کو سمیٹے ہوئے ہیں۔ اکبر کی طرح واہیؔ نے بھی اپنے عہد کی ناہمواریوں کو اپنے طنز ومزاح کا نشانہ بنایا؛ لیکن یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ واہیؔ کے تجربات اکبر سے وسیع تھے۔ اکبر جہاں ماضی کی عظمت رفتہ کے مداح نظر آتے ہیں، واہیؔ کے یہاں جمہوری اقدار کی حصولیابی کی طلب عصری معاشرے کی عظمت کے لیے ضروری قرار پاتی ہے۔

واہیؔ کے کلام کا چھٹا مجموعہ ''متاع واہی'' بہار اردو اکیڈمی کے جزوی مالی تعاون سے ۱۹۷۷ء میں منظر عام پر آیا، یہ ۳۲۸ر صفحات پر مشتمل ہے، اس میں ۱۳۸ر نظمیں اور ۲۶ر منظوم خطوط شامل ہیں۔ اس کتاب میں بھی گذشتہ مجموعے کی منظومات اور خطوط شامل ہیں۔ زیر نظر مجموعے میں ''لے دہی''، ''عورتوں کا سال''، ''انٹرویو''، ''ماسٹر پلان''، ''غالب صدی اور اردو''، ''انٹلیکچوئل''، ''جنرل اسپتال''، ''لیڈری کا نسخہ''، ''لال فیتہ''، ''ماہر فن''، ''ریل کا سفر''، ''وفاتی''، ''تبصرہ نگاری''، ''نئے لیڈر کی دعا''، ''ایک اشتہار''، ''اپیل''، ''الکشن''، ''بلیڈ''، ''چاند اور شاعر''، ''چاند

اورمحبوب‘‘، ’’زبان‘‘، ’’گرومورفوڈ‘‘، ’’لیلائے کرپشن‘‘، ’’محقق‘‘، ’’نقاد‘‘، ’’گویا شاعر‘‘، ’’مشاعرہ اور کامریڈ‘‘، ’’مشاعرہ سے پہلے اور بعد‘‘، ’’یلغار سے انتشار تک‘‘، ’’فہرست حمار‘‘، ’’نیا ہاتھی‘‘، ’’تحسین جدید‘‘، ’’راشن کی دوکان‘‘، ’’اے میری زیرپائی‘‘، ’’اے لکچرر‘‘، ’’میں اسٹوڈنٹ ہوں‘‘، ’’پروفیسر نامہ‘‘، ’’پی ایچ ڈی‘‘، ’’انتقال کے بعد‘‘، ’’حضرت کاتب‘‘، ’’واہی‘‘، ’’بڑا صاحب‘‘، ’’شاعر‘‘، ’’مُلّا‘‘، ’’ایڈیٹر‘‘، ’’پلیڈر‘‘، ’’لیڈر‘‘، ’’پروفیسر‘‘، ’’نقاد‘‘، ’’فلسفی‘‘، ’’تحریک شعرستان‘‘، ’’تشکیل شعرستان‘‘، ’’شعرستان سے ایک خط‘‘، ’’شعرستان میں شاعروں کے خاندان‘‘، ’’شعرستان میں دستورسازی‘‘، ’’شعرستان کی نئی نسل‘‘، ’’شعرستان میں الکشن‘‘، ’’شعرستان اور ناقد‘‘، ’’شعرستان میں دل بدلی‘‘، ’’شعرستان میں کبوتر بازی‘‘، ’’شہرت کے لیے‘‘، ’’شکوہ اللہ سے‘‘، ’’گھریلومنصوبہ‘‘، ’’مچھروں کا گیت‘‘، ’’اللہ رے مادّہ‘‘، ’’شاعر بسیارگو‘‘، ’’آئینہ‘‘، ’’ڈکٹیٹر کا سر‘‘، ’’مکھن‘‘، ’’معرکہ جہیز و دین مہر‘‘، ’’رشوت‘‘، ’’ملازمت‘‘، ’’ہم نے چاہا تھا‘‘، ’’خدمت ادب‘‘، ’’خدام ادب‘‘، ’’اقتباساتی ادیب‘‘، ’’مکتوبی ادیب‘‘، ’’رحمانیہ ہوٹل‘‘، ’’جدید عملی تنقید‘‘، ’’طوق زریں‘‘، ’’کھجور‘‘، ’’ترقی‘‘، ’’ایک ہنگامہ پہ موقوف‘‘، ’’ہم کون ہیں، ہم کیا ہیں‘‘، ’’دیش بھکت‘‘، ’’چال‘‘، ’’الکشن اور برقعے‘‘، ’’الزام‘‘، ’’مولوی اور کامریڈ‘‘، ’’رسائل میں چھپنے کی ترکیب‘‘، ’’رسائل مفت حاصل کرنے کی ترکیب‘‘، ’’ایڈیٹر کا دردسر‘‘، ’’کارپوریشن میں مشاعرہ‘‘، ’’کر پریشاں‘‘، ’’یو این او‘‘، ’’نقاد چی‘‘، ’’چمر چٹ‘‘، ’’شہرت اضافی‘‘، ’’بانیان مشاعرہ‘‘، ’’مشاعرہ‘‘، ’’عرض کاتب‘‘، ’’شاعر مئے خوار‘‘، ’’انہماک‘‘، ’’قبلہ آپ‘‘، ’’سکندرنامہ‘‘، ’’مقدر‘‘، ’’میر فتنہ‘‘، ’’فلم اسٹار‘‘، ’’افواہ نگار‘‘، ’’نورچشم‘‘، ’’دلیل‘‘، ’’ٹیڈی کفن‘‘، ’’موجد‘‘، ’’نگرانی‘‘، ’’آبادی کا مسئلہ‘‘، ’’ویلفیئر اسٹیٹ‘‘، ’’آبادکاری‘‘، ’’اے بھائی مصدق‘‘، ’’چرچل کی مناجات‘‘، ’’قیام امن‘‘، ’’اسم اعظم‘‘، ’’اشٹ گرہ‘‘، ’’نئی یونیورسٹی‘‘، ’’ٹیوشن‘‘، ’’لفافے‘‘، ’’لیبرلیڈر‘‘، ’’ٹیڈی بوائے‘‘، ’’ٹیڈی گرل‘‘، ’’حضرت خدنگ‘‘، ’’جاگیرداری‘‘، ’’چارسوبیس‘‘، ’’چمچے‘‘، ’’کنٹرول‘‘، ’’بلیک مارکٹ‘‘، ’’بلیک مارکٹر‘‘، ’’پیروی‘‘اور ’’جشن شاعر‘‘ نظمیں شامل ہیں۔ علاوہ ازیں اس میں دلاور فگار، حکیم غبار بھٹی، صلاح الدین نیر، حاجی ڈاکٹر عزیز تمنائی، پرکاش فکری، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی، ڈاکٹر سید محمد عقیل، مجتبیٰ حسین، پروفیسر اختر قادری، جگن ناتھ آزاد، رؤف خلش، مصطفٰے کمال، گوپال متل، بہاءالدین احمد کلیم، ڈاکٹر مظفر حنفی، وفا ملک پوری، پروفیسر عبدالمغنی، خالد رحیم،

سنتوکھ سنگھ معصوم، سلطان اختر، پروفیسر تاج پیامی، مناظر عاشق ہرگانوی، کرامت علی کرامت اور ڈاکٹر اسلم آزاد کے نام منظوم خطوط بھی زینت مجموعہ ہیں۔

’’متاع واہی‘‘ میں عصری زندگی کی تمام تر حقیقتوں کو طنزیہ ومزاحیہ پیرائے میں اس طرح بے نقاب کیا گیا ہے کہ واہی کی شاعری ہر عام و خاص کو اپنے عہد کا منظر نامہ دکھاتی ہے۔ ’’متاع واہی‘‘ میں واہی نے موجودہ معاشرے کے آئینے دکھائے ہیں اور سماج میں پھیلی ہوئی برائیوں، بدعنوانیوں، خامیوں، بے اعتدالیوں اور کج ادائیوں کا پردہ فاش کیا ہے۔ انہوں نے مولوی، مُلّا، لیڈر، پلیڈر، کامریڈ، رشوت خور آفیسر، محبوب، طلبہ، ڈاکٹر، پروفیسر، فلسفی، ماہرفن، قصیدہ خواں شعرا، نقاد، ایڈیٹر، کاتب، تبصرہ نگار، محقق، مکتوبی ادیب، اقتباساتی ادیب اور خدام ادب سبھوں کا دلچسپ انداز میں خاکہ کھینچا ہے۔ واہی نے اپنے زمانے کے چھوٹے بڑے مسائل کو اپنی طنز وتنقید کا ہدف بنایا ہے۔ انہوں نے اپنے دور کے عام و خاص افراد کے علاوہ سرکاری وغیر سرکاری محکموں کے اعلیٰ افسران کی کوتاہی اور لاپرواہی پر بھی توجہ مرکوز کی ہے۔ ان کی متجسس نگاہ سماج کے مخفی امور پر بھی تھی۔ انہوں نے ان سماجی خیرخواہوں جو چھپ کر لوگوں کے ساتھ دھوکہ دھڑی وفریب کاری اور ریا کاری ومکاری کرتے ہیں، انہیں بھی اپنی طنز وتمسخر کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کی طنز کا ہدف کچھ ایسے لوگ بھی ہیں، جن کی مٹھیوں میں زندگی کا پورا نظام؛ یعنی زندگی کی رفتار اور ملک کا کاروبار ہوتا ہے۔ واہی ایک صاف گو اور صاف دل انسان تھے؛ اسی لیے انہوں نے انسانیت کی پامالی کا سبب بننے والے جرثومے کو بڑی سلیقگی سے ڈھونڈ نکالنے کی کامیاب سعی کی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ جب تک ہمارا قانونی نظام درست نہیں ہوجاتا، تب تک خوشحالی کا تصور ممکن نہیں، لہٰذا انہوں نے ان چیلنجز کے پیش نظر اصلاحاً، ہجو کو اپنایا اور اپنی بے باکی و بے خوفی کا مظاہرہ کیا۔ دراصل سماج اور افراد میں پھیلی نااتفاقی اور ناآسودگی کو ختم کرنا ان کا عین مقصد تھا۔ اپنے اس مقصد میں وہ پوری طرح کامیاب وکامران ہیں۔

واہی نے زندگی کے حقائق کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا۔ سیاسی اور مذہبی ناہمواری کے علاوہ اخلاقی، تعلیمی، ادبی اور اقتصادی زندگی میں آئی بوالعجبیاں ان کی طنز وتنقید کا نشانہ بنی رہیں۔ ’’متاع واہی‘‘ میں موضوعات کی ایک وسیع دنیا آباد ہے۔ عصر حاضر میں مزاح نگاری اور بیشتر مزاحیہ شاعروں کی شاعری کا موضوع بیوی اور گھر گرہستی تک محدود ہو کر رہ گیا ہے، اس کے برعکس واہی کی شاعری میں پورا سماج اور اس میں بکھرے مسائل کا احاطہ ہوا ہے۔ ’’متاع واہی‘‘ میں واہی نے محض ذات

کارونا نہیں رویا ہے؛ بلکہ سماج کے ناسوروں پر نشتر زنی کر کے اسے تمام لوگوں کو دکھایا ہے۔ ڈاکٹر سید حامد حسین نے ''متاعِ واہی'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''کلام واہی ایک ایسا نگار خانہ ابلیسی ہے کہ جس میں قبائح وخبائث سے ایسی نظر فریب جلوہ سامانیوں کے ساتھ بالا خانوں سے نوازش کی بارش کرتے ہیں کہ فاؤسٹ کی طرح جان وایمان رہن رکھ کر دل قدموں میں رکھ دینے کو جی چاہتا ہے''۔

(''رضا نقوی واہی: آئینہ در آئینہ'' مرتبہ: ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ص:۳۶۰)

اردو شاعری کی مزاحیہ تاریخ میں واہیؔ، اکبر الہ آبادی کے بعد غالباً پہلے شاعر ہیں، جنہوں نے مزاحیہ شاعری کے رکے ہوئے قافلے کو نئی سمت سفر عطا کی۔ اکبر کی شاعری کا دائرہ بہت محدود تھا، ان کے سامنے جو سماج تھا، اس کی بھرپور عکاسی اکبر نے اپنے انداز واسلوب سے کر دی۔ واہیؔ کی فکر اور ان کے مزاج کا معیار اکبر سے کہیں زیادہ بلند ہے، اس کی وجہ بالکل صاف ہے کہ واہیؔ کے زمانے کا سماج زیادہ پیچیدہ نہیں؛ بلکہ ترقی یافتہ اور اکبر سے کہیں زیادہ مسائل سے بھرپور ہے۔

''متاعِ واہی'' کی شاعری کی بنیاد اور فکری اساس ان اصلاحی، اخلاقی اور تعلیمی پہلوؤں پر ہے، جو ہمارے سماج کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اس مجموعے کی تمام شاعری امید اور یقین کی شاعری ہے، برے سے برے حالات میں بھی شاعر امید کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔

واہی نے بیشتر نظمیں زمانے کی بدعنوانی اور بے ضابطگی سے متاثر ہو کر لکھی ہیں۔ انہوں نے اکبر کی مانند اپنے فطین ذہن کے ظریف کیمرے سے کچھ ایسی تصویریں کھینچی ہیں، جنہیں دیکھ کر ماضی کے ساتھ ساتھ عصر حاضر میں پیدا ہوئی خرابیاں بھی واضح ہو جاتی ہیں۔ ان کی کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں، جو ہمیں زندگی کی ترقیوں اور تبدیلیوں میں بڑھتے گناہوں کے عذاب سے بھی خبردار کرتی ہیں۔ ''عورتوں کا سال'' میں عورت کی حریت سے سماج میں پھیلی بے حیائی اور اس کے منفی نتائج کو آشکار کیا گیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیے:

عورتوں کا سال کیا آیا قیامت آ گئی   اک وبائی شکل میں مردوں کی شامت آ گئی
یک بیک آیا سماجی زندگی میں انقلاب   کاروبارِ زیست میں چلنے لگا الٹا حساب
مرد سارے دوسرے درجے کے شہری بن گئے   یعنی جتنے بھی مگرمچھ تھے گلہری بن گئے
بیویوں پر تھا جو قائم شوہروں کا سامراج   دفعتاً اس پر پڑی ضربِ اصول کامراج

گھر کے اندر دائی ماما جو کیا کرتی تھیں کام   مرد اب انجام دیں گے وہ فرائض صبح وشام
صاحبوں سے کرسیاں دفتر کی خالی ہو گئیں   بی بیاں ان کی جگہ مختار و والی ہو گئیں
زن مریدی کام آئی گھر میں گھس جانے کے بعد   رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد

نظم ''لیڈری کا نسخہ'' میں لیڈروں کی مختلف کمزوریوں کو نشان زد کرتے ہوئے انہیں ہدف طنز بنایا گیا ہے۔ واہیؔ بے روزگاروں کو یہ رائے دیتے ہیں کہ:

وہ لوگ آج کل جنہیں فکر معاش ہے   آسودگیٔ زیست کی جن کو تلاش ہے
اس کے عوض کہ جا کے کہیں نوکری کریں   واہی کا مشورہ ہے کہ وہ لیڈری کریں

اس کے بعد وہ اس کے لیے جو نسخۂ کیمیا بتاتے ہیں، وہ کچھ یوں ہے:

ایمان اور ضمیر کو پہلے کھرل کریں   اور اس کے بعد خون حمیت میں حل کریں
تخم ریا کو عقل کے کانٹے پہ تول لیں   سازش کا زہر، شہد فصاحت میں گھول لیں
بادام خلق و پستۂ تہذیب بیس لیں   دونوں کو خوب سل پہ شقاوت کے پیس لیں
سچ میں سفید جھوٹ کا پانی ملائیں پھر   حرص و ہوس کی آنچ پہ سب کو پکائیں پھر
انڈے بھی کچھ حسد کے ہوں لحم خودی کے ساتھ   دونوں کو کھائیں بغض وعداوت کے گھی کے ساتھ

اور پھر اس کے بعد جو نتیجہ سامنے آئے گا، وہ یہ ہوگا کہ:

ٹھوکر سے اپنی فتنۂ محشر جگائے گا   اور ملک پر عذاب خدا بن کے چھائے گا
تخم ہوس سماج کی کھیتی میں بوئے گا   طوفان بن کے قوم کا بیڑا ڈبوئے گا

واہی نے مستقبل کے لیڈران کا جو حال واحوال بیان کیا تھا، وہ آج من وعن ویسا ہی دکھائی دے رہا ہے۔ ان کی نگاہ سیاست، تعلیم، ادب اور اخلاق کے ساتھ معاشرے کے ظاہر و باطن پر بھی جمی رہی۔ انہوں نے معاشرے کی عیاری ومکاری کو شدت سے محسوس کیا اور اپنی فنکارانہ بصیرت اور علمی ذہانت سے اس کے ذمہ دار لوگوں وطبقوں کو اپنی طنز وتمسخر کا نشانہ بناتے ہوئے ان کی فریب کاری، خود غرضی، چور بازاری کے علاوہ طبقاتی منافرت پھیلانے اور آسودگیٔ زیست کو انتشار کا رخ دینے والوں کا قلع قمع کیا۔ ایسے موقع پر شاطر ذہنوں سے نپٹنے کے لیے کبھی کبھی وہ انتہا پسندانہ رویہ بھی اختیار کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

واہیؔ نے کالج، یونیورسٹی کے طلبہ، لکچرر، پروفیسر اور محقق وغیرہ پر بھی خوب نظمیں کہی ہیں۔

''انٹرویو'' میں آج کے طلبہ کے جوابات بہت دلچسپ اور فکر انگیز ہیں۔ ''پروفیسر نامہ'' ان کی ایک ایسی نظم ہے، جو نظیر اکبرآبادی کی نظم ''آدمی نامہ'' کی یاد دلاتی ہے۔ ''ٹیڈی بوائے'' اور ''ٹیڈی گرل'' میں نوجوانوں اور جواں سالوں کی فیشن پرستی کی شدید مذمت کی گئی ہے۔

واہی صاحب کے کلام میں تکلف بھی ہے، تصنع بھی ہے اور مبالغہ آرائی بھی؛ اس لیے کئی مقامات پر حالات و واقعات کی اصلیت اور حقیقت پوری طرح ابھر نہیں سکی؛ لیکن مجموعی طور پر ان کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری موجودہ زندگی اور دنیا کی سچائیوں کا احساس کراتی ہے۔ انہوں نے حالات و واقعات کی الجھنوں سے کرداروں کے مکالموں سے بہت اچھا طنز و مزاح پیدا کیا ہے۔ اس سلسلے میں واہی نے جس خلاقانہ ذہانت اور قابلیت کا مظاہرہ کیا ہے، وہ یقیناً قابل داد ہے۔

طنز و مزاح کا کام صرف ہنسنا ہنسانا اور ناہمواریوں اور ناپسندیدہ چیزوں کو نشانۂ تمسخر بنانا ہی نہیں ہے؛ بلکہ طنز و مزاح کے ذریعہ قلم کار اصلاح و ترقی کا پیغام بھی دیتا ہے۔ رضا نقوی واہی نے اس اہم نکتہ کا لحاظ رکھ کر بہت ہی خوبصورت طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی ہے۔ ان کی شاعری پڑھ کر ہم ہنستے بھی ہیں، قہقہے بھی لگاتے ہیں اور اپنے دل و جگر میں خلش بھی محسوس کرتے ہیں اور یہ بھی جان لیتے ہیں کہ وہ ہمیں کس اصلاح اور کس ترقی کا پیغام دینا چاہتے ہیں۔ ''متاع واہی'' کی مشمولات پر اظہار خیال کرتے ہوئے سید حامد حسین نے بجا فرمایا ہے کہ!

> ''آج کل مزاحیہ کیپسلوں کا چلن ہے اور طنز نسواڑ کی ڈبیہ میں ملتا ہے کہ چٹکی میں دماغ ماروشن اور دل ماشاد؛ لیکن متاع واہی طنز و مزاح کا سوپر بازار ہے کہ بشمول غلط نامہ، ۳۲۸ صفحات پر پھیلا ہوا ہے..... طنزیہ اور مزاحیہ منظومات کا جلوق ودق مجموعہ ایک ایسا کرشمہ معلوم ہوتا ہے، جسے جدید صحافیانہ اصطلاح میں حادثہ کے لفظ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے''۔

(''رضا نقوی واہی: آئینہ در آئینہ'' مرتبہ: ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ص:۳۵۹)

واہی کا ساتواں شعری مجموعہ ''شعرستان واہی'' ۱۹۸۳ء میں بہار اردو اکیڈمی کے مالی اعانت سے طبع ہوا۔ یہ ایک منفرد تخلیق ہے، جسے واہی نے ۱۹۷۱ء سے ۱۹۸۲ء کے دوران وقفے وقفے سے قلم بند کیا ہے۔ ان کی اس سریز کی متعدد نظمیں گذشتہ مجموعوں میں بھی شامل تھیں۔ ''شعرستان واہی'' میں مزید چند حصوں کا اضافہ کیا گیا ہے۔ اس شعرستان میں جو نظمیں شامل ہیں، ان کے عنوانات ہیں: ''تحریک شعرستان''، ''تشکیل شعرستان''، ''شعرستان سے ایک خط''، ''شعرستان میں شاعروں کے خاندان''،

''شعرستان میں دستور سازی کی کوشش''، ''شعرستان کی نئی نسل''، ''شعرستان میں الکشن''، ''شعرستان میں کبوتر بازی''، ''شعرستان اور ناقد''، ''شعرستان میں مکمل انقلاب''، ''شعرستان سے شاعروں کا اغوا''، ''مغویہ شاعروں کا خط نقاد کے نام''، ''اغوا شدہ شاعروں کا حشر''، ''نیم وحشی شاعروں کا انجام'' اور ''زوال شعرستان''۔ یہ مسلسل اور مربوط نظمیں ہیں۔ ان طویل ڈرامائی نظموں کا اختصاص یہ ہے کہ ہر نظم ایک دوسرے سے منسلک ہوتے ہوئے بھی غزلیہ اشعار کی طرح اپنے آپ میں مکمل ہیں۔ ''شعرستان واہی'' دراصل واہی کی مزاحیہ سریز نظموں کا ایک حسین گلدستہ ہے، جس میں ان کی غیر معمولی اختراعی قوت، تخیل کی بلند پروازی، خیالات و واقعات کا تنوع اور بندش الفاظ کی چستی اوج کمال پر نظر آتی ہے۔ واہی اپنی قوت متخیلہ کے ذریعے شعرستان کے نام سے ایک خیالی دنیا خلق کرتے ہیں۔ یہ ایک ایسی مملکت ہے، جس میں شاعروں کو بسایا جاتا ہے، ملک میں جب مردم شماری کی گئی تو پتہ چلا کہ یہاں دو کروڑ اکسٹھ ہزار شعرا آباد ہیں اور جن کی اکثریت بے عمل اور بے روزگار ہے۔ ملک کے شکستہ و بدحال شعرا حضرات اپنے لیے ایک الگ اسٹیٹ کی تشکیل کا مطالبہ کرتے ہیں، جہاں وہ آزادانہ طور پر شعر و شاعری میں غرق رہ سکیں، اپنی خود مختار زندگی میں وہ جب چاہیں جاگیں اور جب چاہیں سوئیں، گویا ان کے اٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے اور مرنے جینے پر کوئی پابندی عائد نہ ہو۔ اس ضمن کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ملک میں مردم شماری سے ہوا یہ آشکار	صرف شاعر ہیں یہاں پر دو کروڑ اکسٹھ ہزار
ان میں بھی دس بیس فلمی شاعروں کو چھوڑ کر	سب خدا کے فضل سے ہیں بے عمل بے روزگار
شہر تو ہیں شہر کوئی گاؤں بھی ایسا نہیں	از کمایوں تا دکن از پوربندر تا بہار
جن کی گلیوں اور کوچوں میں نظر آتے نہ ہوں	اوسطاً دس آدمی کے بیچ شاعر تین چار
جیسے ہی اخبار والوں نے اچھالی یہ خبر	شاعروں کا بخت خفتہ جاگ اٹھا ایک بار
چند لیڈر قسم کے حضرات کو موقع ملا	آ گئی ان کی خزاں دیدہ قیادت میں بہار
اک اہم اسکیم ان کے ذہن نے تیار کی	جس میں ذاتی اور قومی فائدے تھے بے شمار
لیڈروں نے رکھ کے اس اسکیم کو پیش نظر	اک نئی تحریک کی ڈالی بنائے استوار
شاعروں کی اک الگ اسٹیٹ ہونی چاہیے	جس میں ان کو مرنے جینے کا ہو پورا اختیار
قومیت کے نام پر جب ملک کی تقسیم ہو	اپنے حق کے واسطے لڑتے ہوں جب بھنگی چمار
شاعروں کی قوم کچھ ان سے گئی گزری نہیں	کیوں رہے وہ زندگی بھر کسمپرسی کا شکار

اس طرح شعرستان کے لیے باقاعدہ تحریک شروع ہوئی، ہڑتالیں کی گئیں اور جلوس نکالے گئے۔ آخر کار حکومت کو ان کا مطالبہ ماننا پڑا۔ مدراس کے ساحل کے قریب بحر ہند میں ''شاعرستان'' کے نام سے ایک علاحدہ ریاست تشکیل کی گئی اور شاعروں کو اس کے نظم ونسق کا اختیار مل گیا۔ اب شاعر رات میں مشاعرہ کرتے اور دن میں مچھلیوں کا شکار، یہی ان کا واحد ذریعۂ روزگار تھا، وہاں تاڑ کے پیڑ تھے اور جنگلی بیروں کے درخت، لہٰذا وہ تاڑی پیتے اور مچھلیوں و بیروں سے پیٹ بھرتے ہیں۔ شعرستان میں نائی اور دھوبی کا وجود نہیں، لہٰذا ہر چہرے پر لمبی داڑھی جھولتی ہے اور سب کے کپڑے گندے غلیظ ہیں۔ شاعروں کے الگ اسٹیٹ میں بس جانے سے لکھنؤ، دہلی، عظیم آباد اور دیگر شہروں کے چائے خانے ویران ہو چکے ہیں، ناقدوں کا کاروبار ٹھپ پڑ چکا ہے؛ اس لیے اب وہ نقاد سے محقق بن گئے ہیں:

دفعتاً ٹھپ پڑ گیا لیکن یہ سارا کاروبار　　دیکھتے ہی دیکھتے سب ہو گئے بے روزگار
ایک بھی شاعر نہیں تھا جس پہ شب خوں مارتے　　سب نظر آنے لگے بیٹھے ہوئے جوں مارتے
قدر شاعر تب وہ سمجھے ٹھوکریں کھانے کے بعد　　'رنگ لاتی ہے حنا پتھر پہ پس جانے کے بعد'
وقت وہ آیا کہ ہر ناقد محقق بن گیا　　یعنی مجبوراً گڑے مردوں کا عاشق بن گیا
الغرض اس ملک میں تشکیل شعرستان سے　　مختلف طبقات گزرے مختلف بحران سے

شعرستان میں آباد شعرا مختلف گروپوں میں منقسم ہو گئے، ان کے الگ الگ گروہ بن گئے، جن کا رشتہ مشہور و معروف شاعروں اور نقادوں کی مختلف ٹولیوں سے استوار ہوا، کوئی فاروقی تو کوئی نارنگ، کوئی جعفری تو کوئی جذبی اور کیفی کا پیروکار بنا۔ شعرستان میں ایک دستور بنانے کی سعی کی گئی؛ لیکن اختلاف رائے کے سبب دستور سازی میں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ واہیؔ نے نظم ''شعرستان میں دستور سازی کی کوشش'' میں مختلف مکاتب فکر کے نظریات کا جائزہ بہت ہی دلچسپ پیرائے میں لیا ہے:

مختلف اہل سخن نے اپنے اپنے طور پر　　رائے دی دستور میں ترمیم یا تنسیخ کی
مثنوی میں خامیاں ڈھونڈیں زباں کی جابہ جا　　ایک شاعر نے جو تھے شاگرد نوح ناروی
ان کا کہنا تھا کہ بندش چست ہونی چاہیے　　شعر کے اندر بلا سے ہو نہ فکری تازگی
ایسے شاعر جو کہ حامی تھے ترقی واد کے　　ان کا کہنا تھا کہ شاعر کا سخن ہو مقصدی
خواہ شعرستان میں اس کا نہ ہو کوئی وجود　　لازماً دکھلائی جائے کشمکش طبقات کی

اس کے بعد شعرستان میں واہی الیکشن، حکومت کی تشکیل اور شاعروں کی رہائش کی عمدہ نقش گری کرتے ہیں، پھر شعرستان میں کس طرح انتشار پیدا ہوتا ہے اور وہ شکست وریخت کا شکار ہو جاتا ہے، اس کے کوائف کا بھی ذکر کرتے ہیں، شعرستان میں مکمل انقلاب آنے کے بعد سے ہی زوال کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ سیاست کی گرم بازاری سے وہاں کے سخن وروں کا اغوا شروع ہوا اور اس جال میں حضرت واہی بھی جکڑے گئے۔

جب سخنور ارض شعرستان کے پکڑے گئے　　جال میں واہی بھی ان کے ساتھ ہی جکڑے گئے
آگے آگے تھے جو وہ تحریک شعرستان میں　　حیثیت ان کی اہم تھی مغویہ سامان میں
اس لیے اسمگلروں کی خاص نگرانی میں تھے　　اپنی بداعمالیوں سے خود پریشانی میں تھے
ارض شعرستان کا دکھلا کے سرخ وسبز باغ　　کر دیا تھا شاعران خوش نوا کو بد دماغ
ورغلا کر لے گئے تھے ان کو ہندوستان سے　　قوم نقادوں کی برہم تھی ہی جی سے جان سے

شاعروں کی اکثریت بھی خفا رہنے لگی
کچھ تو درپردہ مگر کچھ برملا رہنے لگی

''شعرستان واہی'' وہ شاہکار تصنیف ہے، جسے ہم موجودہ دور کا ایک طنزیہ عہد نامہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ واہیؔ کی محض تصوراتی دنیا نہیں؛ کیوں کہ انھوں نے اس کا مواد ہمارے معاشرے اور سیاسی نظام سے ہی اخذ کیا ہے۔ اس کی اکثر نظمیں ہمارے ملک کے سماجی، سیاسی، اقتصادی اور علمی وادبی حالات ومسائل سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں۔ شعرستان کی مربوط نظموں میں ہمارے ملک کی کچھ ایسی تصویریں سامنے آئی ہیں، جو زندگی کے ٹوٹتے بکھرتے ہوئے رشتے کے اسباب وعلل اور سماجی وسیاسی مسائل کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ہر چند کہ شعرستان کی نظموں کا تعلق زیادہ تر ادبی اور تخلیقی موضوعات ومسائل سے ہے۔ اس میں شاعروں کی ایک الگ ریاست کی تشکیل کے لیے چلائی گئی تحریک، اس کی منظوری اور پھر اس کے بعد ہونے والے انقلاب وانتشار کا منظر نامہ پیش کیا گیا ہے؛ مگر اس کے ذریعہ شاعر نے ہمیں کثیر آبادی اور بے روزگاری کے علاوہ تعلیم وتہذیب کے فقدان سے ملک میں جس طرح کی مہلک فضا قائم ہوئی ہے، اس کی خوفناکیوں اور سنگینیوں سے بھی متنبہ کیا ہے۔ واہیؔ کے شعرستان کے پس پردہ کئی ایسے مشاہدے بھی سامنے آئے ہیں، جو عقل کو حیران کر دینے والے ہیں اور جن کے ذریعے ہمارے سماج کے چند نام نہاد افراد بے نقاب ہو جاتے ہیں۔ وہ ایسے افراد پر طنز

کستے ہیں، جن کی زندگی کا کوئی نصب العین ہی نہیں۔ واضح رہے کہ شعرستان میں طنز وتمسخر کا نشانہ کچھ ایسے سفید پوش حضرات بھی بنے ہیں، جو اپنی شرافت کی آڑ میں آئین وقانون کی دھجیاں اڑاتے ہیں اور انسانیت وتہذیب کے مخالف رہے ہیں۔ واہی انسانی نفسیات پر دسترس ہی نہیں رکھتے ہیں؛ بلکہ اس کے عمدہ نباض بھی ہیں۔ وہ نفسیاتی باریکیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے فرد اور سماج کی دکھتی رگوں پر بڑی بے خوفی اور بے باکی سے انگلی رکھتے ہیں۔ شعرستان کے آئینے میں ہم زندگی کے کریہہ پہلوؤں کو دیکھتے ہیں۔ واہی ہر جگہ ہنسی اور مسکراہٹوں کے ساتھ سماج، سیاست، اخلاق، تہذیب اور تعلیم کے نگراں بنے بیٹھے ملتے ہیں۔ وہ انصاف، مساوات اور امن وآسودگی کی بحالی میں رخنہ اندازی کرنے والوں کو کبھی گوارہ نہیں کرتے۔ ان کی نگاہ میں انتہا پسندی اور نکسل واد، سماج کے لیے ایسے ناسور ہیں، جن سے زندگی کو نقصان پہنچتا ہے اور امن، چین، ترقی اور خوشحالی ناپید ہو جاتی ہے۔ ڈاکٹر سید حسن عباس نے ''شعرستان واہی'' پر اظہار خیال کرتے ہوئے ٹھیک ہی لکھا ہے کہ:

> ''شعرستان کے پردے پر ہم ہندوستان کی سیاسی، سماجی، ثقافتی، ادبی اور تہذیبی صورت حال کو منعکس ہوتے دیکھتے ہیں۔ افسانوی طرز پر پورے ملک کے حالات کی منظر کشی کر دی گئی ہے، جو حقیقت سے قریب ہے۔ صرف وہ حصہ جس میں شاعروں کا جل پریوں سے اتصال کا بیان ہے، داستانی طرز کا حامل ہے۔ واقعاتی لحاظ سے اس طویل نظم کی تخلیق میں واہی نے زبردست قوت متخیلہ کا مظاہرہ کیا ہے۔ وہ اصول وآئین جو انسانی اقدار وروایات کے منافی ہیں، ان کا کھل کر مذاق اڑایا گیا ہے''۔

(''رضا نقوی واہی: آئینہ در آئینہ'' مرتبہ: ڈاکٹر ہمایوں اشرف، ص: ۳۹۴)

واہی نے ''شعرستان'' میں ملکی سطح پر رونما ہونے والے حالات و واقعات کا حقیقت پسندانہ احاطہ کیا ہے۔ اس کی نظموں کو پڑھتے ہوئے یہ احساس ہوتا ہے کہ ہم کسی تصوراتی دنیا کی نہیں؛ بلکہ ہم اپنی دیکھی بھالی حقیقی دنیا کی سیر کر رہے ہیں۔ اس کی ماجرا سازی، جزئیات نگاری، منظر کشی، انداز بیان اور اسلوب میں جو حسن وجاذبیت ہے، وہ اسے یقیناً ایک شاہکار فن پارہ بنا دیتی ہے۔ خود واہی بھی اسے اپنا شاہکار تسلیم کرتے ہوئے ہمیشہ شکوہ کناں رہے کہ اہل نظر کے درمیان اس کی خاطر خواہ پذیرائی نہ ہو سکی۔ شعرستان سیریز کی نظموں کے علاوہ چند متفرق نظمیں بھی اس مجموعے کی زینت بنی ہیں۔ متفرق نظموں کے عنوانات یہ ہیں: ''آب حیات''، ''میرے چمچو''، ''ایک چادر کو ترستی رہی''، ''سہاگن بیوہ''، ''بیچارہ

شاعر''، ''نوارا تلخ ترمی زن''، ''اتنی سی بات تھی''، ''جشن ظرافت''، ''ہوٹنگ''، ''فرمائش''، ''گو ہاتھ میں جنبش نہیں''، ''الکشن کے بعد''، ''کرسی''، ''بلڈ بار''، ''ہڑتال''، ''گھر جمائی''، ''غزل اور کثرت اولاد''، ''خودکشی''، ''آشوب چشم''، ''انجمن زن مریداں''۔ ان کے علاوہ گذشتہ مجموعوں سے بھی چند نظمیں منتخب کر کے اس میں شامل کی گئی ہیں۔ وہ نظمیں ہیں: ''محقق''، ''نقاد''، ''یلغار سے انتشار تک''، ''پی ایچ ڈی'' اور ''انتقال کے بعد''۔ زیر نظر مجموعے میں علقمہ شبلی، شوکت حیات، خواجہ عبدالغفور، ش۔ م۔ عارف ماہر آروی، اصغر راہی، مظہر امام، شمیم فاروقی اور حکیم غبار بھٹی کے نام منظوم خطوط بھی شامل ہیں۔

یہ ایک قابل لحاظ مجموعہ ہے، جس کی اپنی ایک خاص انفرادیت ہے۔ شعرستان اور متفرق نظموں کا حصہ بھی خوب ہے اور منظوم خطوط کا بھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ بہار، اتر پردیش اور مغربی بنگال کی اردو اکادمیوں نے اس کتاب پر انعامات دئے۔

واہی کے کلام کا آٹھواں مجموعہ ''منظومات واہی'' ۱۹۹۲ء میں جے ٹی ایس پرنٹرز، لنگرٹولی، پٹنہ کے زیر اہتمام شائع ہوا۔ ۲۶۴ر صفحات پر مشتمل اس مجموعے میں ۱۰۸ر نظمیں بعنوان ''محقق''، ''نقاد''، ''یلغار سے انتشار تک''، ''پی ایچ ڈی''، ''انتقال کے بعد''، ''ریل کا سفر''، ''وفاتی''، ''تبصرہ نگاری''، ''چاند اور شاعر''، ''چاند اور محبوب''، ''لے دہی''، ''عورتوں کا سال''، ''انجمن زن مریداں''، ''اکیسویں صدی کی ولادت کے قریب''، ''اکیسویں صدی میں عورتوں کا راج''، ''اکیسویں صدی میں آبادی کا حل''، ''تحقیقی مقالہ برائے فروخت''، ''صومالیہ میں دلاور فگار کا استقبالیہ''، ''وضع داری''، ''اردو کی نس بندی''، ''پاٹلی پترا''، ''آب حیات''، ''میرے چمچو''، ''سہاگن بیوہ''، ''بے چارہ شاعر''، ''ہوٹنگ''، ''فرمائش''، ''گو ہاتھ میں جنبش نہیں''، ''بلڈ بار''، ''ہڑتال''، ''غزل اور کثرت اولاد''، ''انٹر ویو''، ''ماسٹر پلان''، ''غالب صدی''، ''انٹلکچوئل''، ''جنرل اسپتال''، ''لیڈری کا نسخہ''، ''پروگرام واہی''، ''بڑا صاحب''، ''شاعر''، ''ملا''، ''ایڈیٹر''، ''پلیڈر''، ''لیڈر''، ''پروفیسر''، ''نقاد''، ''تحریک شعرستان''، ''تشکیل شعرستان''، ''شعرستان سے ایک خط''، ''شعرستان میں شاعروں کے خاندان''، ''شعرستان میں دستور سازی کی کوشش''، ''شعرستان کی نئی نسل''، ''شعرستان میں الکشن''، ''شعرستان میں کبوتر بازی''، ''شعرستان اور ناقد''، ''شعرستان میں مکمل انقلاب''، ''شعرستان سے شاعروں کا اغوا''، ''مغویہ شاعر کا خط نقاد کے نام''، ''اغوا شدہ شاعروں کا حشر''، ''نیم وحشی شاعری کا انجام''، ''زوال شعرستان''، ''نوارا تلخ ترمی زن''، ''لال فیتہ شاہی''، ''ماہر فن''، ''نئے لیڈر کی دعا''، ''ایک اشتہار''،

''اپیل''، ''بلیڈ''، ''زبان''، ''لیلائے کرپشن''، ''گویا شاعر''، ''مشاعرہ اور کامریڈ''، ''تحسین جدید''، ''مشاعرہ سے پہلے اور بعد''، ''شاعر بسیار گو''، ''اسم اعظم''، ''بانیان مشاعرہ سے''، ''شاعر مئے خوار''، ''جشن شاعر''، ''کارپوریشن میں مشاعرہ''، ''فہرست حمار''، ''نیا ہاتھی''، ''راشن کی دوکان''، ''اے میری زیر پائی''، ''حضرت کاتب''، ''عرض کاتب''، ''پروفیسر نامہ''، ''شہرت کے لیے''، ''شکوہ اللہ سے''، ''گھریلو منصوبہ''، ''مچھروں کا گیت''، ''آئینہ''، ''مکھن''، ''معرکۂ جہیز و دین مہر''، ''خدمت ادب''، ''خدام ادب''، ''اقتباساتی ادیب''، ''مکتوبی ادبی''، ''رحمانیہ ہوٹل''، ''جدید عملی تنقید''، ''مولوی اور کامریڈ''، ''قبلہ آپ''، ''ٹیڈی کفن''، ''گھر کی رونق''، ''ٹیلی وژن''، ''ٹی وی فوبیا''، ''دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو'' اور ۱۸ر منظوم خطوط بنام میر ضاحک، حکیم غبار بھٹی، اویس احمد دوراں، مظہر امام، اصغر راہی، خواجہ عبد الغفور، علقمہ شبلی، دلاور فگار، نظام صاحب، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی، گوپال متل، ڈاکٹر مظفر حنفی، پروفیسر عبد المغنی، ڈاکٹر سید محمد عقیل، ڈاکٹر کرامت علی کرامت، جگن ناتھ آزاد، مصطفٰے کمال، ضیاء الحق قاسمی اور دو طرحی غزل شامل ہیں۔ یہ مجموعہ کسی کے نام معنون نہیں اور نہ ہی اس میں پیش لفظ، یا دیباچہ تحریر کیا گیا ہے۔ زیر نظر مجموعے کی بیشتر نظمیں وہی ہیں، جو واہؔی کی گذشتہ مجموعوں کی بھی زینت بنی ہوئی ہیں، اس میں ان کی نئی نظموں کی تعداد بہت قلیل ہے۔

''منظومات واہؔی'' کے موضوعات میں تنوع ہے۔ حیات و کائنات کے بیشتر پہلوؤں پر واہؔی نے بے لاگ اور بھرپور تبصرہ کیا ہے۔ وہ فطرت انسانی کے چھچھوراپن، شہدہ پن اور لچاپن پر جس بے لاگ انداز میں تبصرہ کرتے ہیں، وہ یقیناً خاصے کی چیز ہے۔ ادب اور ادبی صورت حال ان کا محبوب موضوع رہا ہے۔ واہؔی کا کلام ہمیں صرف ہنسنے ہنسانے کا موقع ہی فراہم نہیں کرتا؛ بلکہ احساس غور و فکر کو بھی بیدار کر دیتا ہے۔ وہ موجودہ محققین کے بابت درست ہی فرماتے ہیں کہ یہ صرف 'دیوان میر میں کتنے نقطے استعمال کئے گئے ہیں اور مومن کے گھر میں کتنے چوہے پلے تھے، یا داغ نے کس وقت دم توڑا تھا' ان کی تلاش و جستجو میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ وہ متعصب ناقدین ادب کی بھی خبر لیتے ہیں، جو ذرے کو آفتاب اور آفتاب کو ذرہ بنانے میں منہمک ہیں۔ پی ایچ ڈی کے لیے تحقیقی مقالہ لکھنے اور فروخت کرنے والے احباب پر بھی انھوں نے خوب نشتر زنی کی ہے۔ عصر حاضر میں جامعاتی تحقیق پر جو زوال آیا ہے، اس سے سبھی واقف ہیں۔ واقعتاً آج یہ ایک انڈسٹری بن گیا ہے، پیسے لے کر تحقیقی مقالہ کوئی اور لکھ رہا ہے اور ایم۔ فل، پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کی ڈگریاں کسی اور کو مل رہی ہیں۔ واہؔی نظم

''تحقیقی مقالہ برائے فروخت'' میں جامعاتی تحقیق کی زبوں حالی کا نقشہ کس دلچسپ پیرائے میں کھینچتے ہیں، دیکھئے:

پیش رفت اردو ادب کی تیز کرنے کے لیے   خشک ہوتے کھیت کو زرخیز کرنے کے لیے
ملک میں دو نمبری دھندوں کی برکت دیکھ کر   اور پھٹی جیبوں کی اپنی قدر و قیمت دیکھ کر
جامعہ کے چند استادوں کو سوجھی دور کی   منچلوں نے کھول ڈالی اک نئی انڈسٹری
اس نجی انڈسٹری میں تھیسسیں ڈھلنے لگیں   اور ریسرچ اسکالروں کی گاڑیاں چلنے لگیں
ایسے ایم اے پاس لڑکوں کی بھی قسمت کھل گئی   اہلیت جن کی کلرکوں کے برابر بھی نہ تھی
ان کو نقلی ڈاکٹر بننا سکھانے کے لیے   خود مقالے لکھ کے پی ایچ ڈی بنانے کے لیے
فیس استادوں نے رکھی، فی مقالہ دس ہزار   جس سے سودا پٹ گیا، بیڑا ہوا جھٹ اس کا پار
دے کے پیسے ختم ہو جاتا ہے شاگردوں کا کام   حضرت استاد کرتے ہیں بقیہ انتظام
اکسٹرنل ممتحن کے پاس جب تھیسس گئی   پیروی جا جا کے اس کے گھر پر خود گائڈ نے کی
وائی وا کے واسطے آیا جونہی اکزامنر   ہوٹلوں میں اس کو کھلوایا گیا لنچ اور ڈنر
ہو کے ممنون کرم اس کو وہی کرنا پڑا   حضرت استاد نے جو کچھ اشاروں میں کہا
جامعہ سے دوسرے ہی روز ڈگری مل گئی   کیکٹس کی شاخ میں گویا کلی سی کھل گئی
تیل کیوں بیچے کوئی پڑھ لکھ کے اردو فارسی   مل ہی جائے گی کسی کالج میں اس کو نوکری
اس مقالہ ساز صنعت سے ہے دہرا فائدہ   ایک کو اجرت ملی اور ایک روزی سے لگا
نسل نو کو درس کیا دیں گے یہ نقلی ڈاکٹر   کس کو فرصت ہے جو اس نکتے پہ ڈالے اک نظر
کس نے تحقیقی مقالہ لکھا، کس کے نام سے   کون دلی جا کے پوچھے گا یہ مالک رام سے
جیب استادوں کی، اچھا ہے، رفو ہوتی رہے   اور برج بانو یونہی بے آبرو ہوتی رہے

اور یہ ایک تلخ سچائی ہے کہ ہماری دانش گاہوں میں ان نقلی ڈاکٹروں سے برج بانو مستقل بے آبرو ہو رہی ہے۔ واہؔی نے بغیر پڑھے کتب و رسائل پر تبصرہ کرنے والوں کو بھی ہدف طنز بنایا۔ گویا وہ شاعر، بانیان مشاعرہ، مکتوبی ادیب، اقتباساتی ادیب، زود گو، وفاتی، مبصر، ایڈیٹر، انٹلکچوئل، پروفیسر، لکچرر، کاتب کسی کو بھی نہیں بخشتے ہیں۔ نظم ''وفاتی'' میں ایک تاریخ گو شاعر کا دلچسپ کردار سامنے آیا ہے، جو تاریخ وفات نکالنے کے لیے قطعات میں مہارت رکھتے اور ہمہ دم کسی کی موت کے منتظر رہا کرتے تھے:

کون مرتا ہے رہتے ہیں اس کی تاک میں چھائی رہتی ہے سدا کافور کی بوناک میں
کوئی دلی میں مرے یا فوت ہو بنگال میں چند قطعے آپ لکھیں گے مگر ہر حال میں
گر کبھی بہرِ عیادت آپ جاتے ہیں کہیں دیکھ کر دم توڑتے بیمار کا حال حزیں
سورۂ یٰسین پڑھنے کے عوض با شد و مد جوڑنے لگتے ہیں بس تاریخ رحلت کے عدد

''گویا شاعر'' میں مشاعرہ باز شاعروں کو سننے اور پسند کئے جانے کے معاملے کو موضوعِ سخن بناتے ہوئے واہیؔ نے کہا ہے کہ ان کے ''بے مغز کلام'' پر داد و تحسین کے جوڈونگر برستے ہیں، اس سے یہ خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان گویا شاعروں کی جھنڈ میں اچھے اور سچے شاعر گم ہو جاتے ہیں۔ ''مشاعرہ اور کامریڈ'' میں واہیؔ نے ایک منعقدہ مشاعرے کی واقعاتی تفصیلات کو پیش کرتے ہوئے ان کے پس پردہ مشاعروں میں روا سیاست پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ ''مشاعرہ سے پہلے اور بعد'' میں بانیانِ مشاعرہ کی تواضع، بیرونی شاعروں کے گرم جوش استقبال اور پھر ان کی کسمپرسی کی عمدہ نقش گری کی گئی ہے۔ واہیؔ ''اقتباساتی ادیب'' پر نہ صرف کاری ضرب لگاتے ہیں؛ بلکہ وہ انہیں چند مفید مشوروں سے بھی نوازتے ہیں:

قبل ہر پیرا کے لکھئے ہے فلاں کا یہ خیال اپنی جانب سے نہ ہرگز کیجئے کچھ قیل وقال
ورنہ کھل جائے گی قلعی اور چھلک جائے گا ظرف ربطِ مضموں کے لیے کافی ہیں بس دو ایک حرف
اس طرح روزانہ اک مضمون لکھتے جایئے اور نوزائیدہ پرچوں میں انہیں چھپوایئے
چھ مہینے سال بھر میں یوں چمک جائے گا نام آپ کو حسرت سے دیکھیں گے سرور واحتشام

واہیؔ کی ایک بہت ہی دلچسپ نظم ہے ''لے دہی''۔ اس میں وہ فرماتے ہیں کہ اردو کی کتابیں اکادمیوں کی مالی اعانت سے تو خوب چھپتی ہیں، مگر وہ فروخت نہیں ہوتیں؛ کیوں کہ اردو والوں کو اپنی زبان سے محبت ہی نہیں، اپنی زبان کے تئیں ان کی بے حسی کا یہ عالم ہے کہ آج آٹے میں نمک کے برابر ہی لوگ اردو کی کتابیں خرید کر پڑھتے ہیں۔ ''لے دہی'' کی طرح فروخت کرنے پر بھی اس کے خریدار نہیں ملتے۔ اس نظم کے آخری تین اشعار ملاحظہ فرمائیں؛ لیکن یہ جس پس منظر میں تحریر کئے گئے ہیں، اس سے لطف اندوز ہونے کے لیے پوری نظم کا مطالعہ لازمی ہے:

جیسے دہی فروش لیے سر پہ ٹوکرا بازار میں پکارتا پھرتا ہے لے دہی

اب یوں ہی اپنے دوش پہ لادے ہوئے کتاب پھرتے ہیں صبح وشام سخنور گلی گلی
واہی بھی باوجود ضعیفی ہے ان کے ساتھ گٹھری ہے اس کے کاندھوں پہ بھی واہیات کی

نظم ''شہرت کے لیے'' میں عصر حاضر کے ویسے شاعروں کو ہدف بنایا گیا ہے، جو شہرت کی خاطر موسم کی طرح رنگ بدلتے ہیں۔ ترقی پسندی کا دور آیا تو شہرت کے لیے روایت پرست سے ترقی پسند بن گئے اور جدیدیت کی لہر شروع ہوئی تو اس رنگ میں رنگ گئے۔ مسدس حالی کی زمین میں یہ ایک دلچسپ اور موثر نظم ہے۔ اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے:

کسی نے یہ سقراط سے جا کے پوچھا کہ اے ماہر حکمت و مرد دانا
بتا کیا ہے تحصیل شہرت کا نسخہ جو ہو زود اثر اور قیمت میں سستا

فلسفی سقراط نے اس کے لیے کیا نسخہ تجویز کیا؟ دیکھئے:

کہا پہلے تو مشق صد چہرگی کر لگا مختلف رنگ کا رخ پہ غازا
نہ دکھلا کبھی اصل چہرہ کسی کو رہے شخصیت تیری بن کر معمہ
ادب میں جو ہو رائج الوقت فیشن بنا اس کو معیار اپنے سخن کا

اس کے علاوہ سقراط نے شہرت کے لیے مزید نسخے بتلائے، مثلاً: کسی رسالے میں کوئی تخلیق شائع ہو تو دوستوں سے اس کی تعریفیں لکھوائی جائیں۔ مدیروں، شاعروں اور ادیبوں سے تعلقات بڑھائیں اور اس کے لیے اپنے گھر پہ ان کی پیہم دعوت کیا کریں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ!

تجھے لفٹ ملتی رہے گی برابر
کہ اب تو زمانہ ہے گھس پیٹھیوں کا

واہیؔ غزل کے انتشار اور کثرت اولاد، دونوں کو اعصابی بخار قرار دیتے ہیں۔ پہلے وہ شاعروں کی دن بہ دن بڑھتی آبادی پر طنز کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

ایک ناقد نے دیا ہے شاعروں کو مشورہ کم سے کم دس سال تک توڑو غزل سے رابطہ
تا کہ اردو شاعری کی جان چھوٹے ضیق سے ہے مسلط قوم کے اعصاب پر یہ کافرہ
بوجھ آبادی کا بڑھتا جا رہا ہے جس طرح یوں ہی گردش میں مسلسل ہیں ردیف وقافیہ
حد تو یہ ہے کہ ایک املا بھی نہیں جس کا درست رات دن غزلوں پہ غزلیں لکھ رہا ہے مسخرہ
کر چکا اپنا مجموعہ مرتب آج وہ ختم جس نے کل کیا اردو کا پہلا قاعدہ

ایسے مجموعوں کا بالآخر یہی ہوتا ہے حشر — گھر میں بنیوں کے بنا کرتا ہے ان کا مقبرہ
اس لیے اے شاعرانِ تیز گام و بے لگام — اپنے ہاتھوں خود کرو غزلوں کی نس بندی کا کام

اور پھر وہ کثرت اولاد پر فرماتے ہیں:

کوئی گھر ایسا نہیں جو مرغی خانے سے ہو کم
روح کیوں لرزے نہ پیدائش کے اس آزار سے

اور آخر میں دونوں کو'اعصابی بخار' سے تعبیر کرتے ہوئے قوم کو یہ باور کراتے ہیں کہ:

کثرت اولاد ہو یا ہو غزل کا انتشار
قوم کے حق میں ہیں یہ دونوں ہی اعصابی بخار

اسی طرح ''جدید عملی تنقید'' میں فیشن زدہ جدیدیت کا اور ''انتقال کے بعد'' میں اردو والوں کی مردہ پرستی کا خوب مذاق اڑایا گیا ہے۔ شعر و ادب کی صورت حال کے بارے میں واہی نے اور بھی نظمیں لکھی ہیں، جیسے: ''تحسین جدید''، ''شاعر مئے خوار''، ''یلغار سے انتشار تک''، ''محقق''، ''نقاد''، ''بے چارہ شاعر''، ''ہوٹنگ''، ''غالب صدی''، ''شاعر بسیار گو''، ''جشن شاعر''، ''کارپوریشن میں مشاعرہ''، ''پروفیسر نامہ''، ''خدمت ادب''، ''خدام ادب'' اور ''شعرستان'' وغیرہ۔

واہی کا سروکار صرف شعر و ادب کے میدان تک محدود نہیں؛ بلکہ انہوں نے گرد و پیش میں ہر آن بدلتی ہوئی عصری زندگی کے تقریباً سبھی پہلوؤں کی نقاب کشائی کی ہے اور ان کی ایسی فطری تصویریں اتاری ہیں، جو ایک مشاق اور صاحب نظر فنکار ہی اتار سکتا ہے۔ اپنے موضوع کے تئیں ان کا ٹریٹمنٹ بڑا ہموار؛ مگر دوٹوک ہوتا ہے؛ اس لیے یہ کہنا مشکل ہوتا ہے کہ ان کی بہترین نظمیں کون سی ہیں۔ واہی کے کلام میں گہرا سماجی شعور ملتا ہے، وہ سماجی اور تہذیبی قدروں کی پامالی و تنزلی کو اپنے طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ حکومت، ارباب حکومت اور سماج کے ہر طبقے کے فرد کو انہوں نے ہدف طنز بنایا ہے۔ واہی نے آزادی کے بعد پروان چڑھنے والے سیاسی اور ثقافتی رویے کو اس کمال فنکاری سے اپنی تحریروں کی اساس بنایا ہے کہ کل کا مؤرخ ہندوستان کے سماجی اور سیاسی، تاریخی حقائق تک آسانی کے ساتھ رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ آج انتخابات کا جو عالم ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، اس میں حصہ لینے والوں پر کسی طرح کی پابندی کا اطلاق نہیں ہوتا۔ ہر بدمعاش، غاصب اور شاطر شخص حکومت میں شامل ہونے پر تیار ہوتا ہے۔ واہی نے نظم ''الکشن'' میں ملک کے بازار سیاست کی عمدہ

نقش گری کی ہے۔ پہلے دیکھئے، وہ الکشن کے زمانہ کی مصوری کس مہارت و صداقت سے کرتے ہیں:

پھر اک نئے الکشن کا آ چلا زمانہ — پھر لیڈروں کے لب پہ جنتا کا ہے ترانہ
تقدیر کے جواری عشرت کدوں سے نکلے — کھلنے لگا سیاست کا پھر قمار خانہ
جلسے جلوس، بھاشن، ہڑتال اور سلوگن — ہر فعل ابلیسانہ، ہر قول شاطرانہ
نیلام ہو رہی ہے جنتا کی پھر لنگوٹی — دن رات کھل رہا ہے چندوں کا کارخانہ
جتنے بلیکیے تھے بگلا بھگت بنے ہیں — ملتے ہیں ووٹروں سے جا جا کے فدویانہ
صیاد و صید دونوں ہیں اپنی اپنی دھن میں — بنتا ہے جال کوئی، چنتا ہے کوئی دانہ

الکشن کا زمانہ آتا ہے تو ہمارے لیڈران عوام سے کیسے کیسے وعدے کرتے ہیں؛ لیکن انتخاب میں فتح یابی کے بعد اپنے ان کئے گئے وعدوں کو بالکل ہی فراموش کر دیتے ہیں۔ واہی اس کی جیتی جاگتی تصویر کچھ یوں پیش کرتے ہیں:

سنو یارو اگر اب کے الکشن جیت جاؤں گا — تو اپنے ووٹروں کو ناچ تگنی کا نچاؤں گا
اگرچہ آج کہتا پھر رہا ہوں بے وقوفوں سے — پسینے پر تمہارے خون اپنا میں بہاؤں گا
غریبی دور کرنے کے سلوگن کو ہوا دے کر — میں سب سے پہلے خود اپنی زبوں حالی مٹاؤں گا
غرض محکوم اور حاکم کا جو رشتہ ازل سے ہے — اسی رشتے کو میں اپنے لیے موڈل بناؤں گا

لیڈران کونسل، اسمبلی اور پارلیمنٹ کے ممبر کی امیدواری کے لیے توڑ جوڑ کرتے ہیں اور ٹکٹ کے لیے ہر جائز و ناجائز حربے استعمال کرنے سے باز نہیں آتے۔ واہی نے نظم ''اپیل'' میں ایسے ہی ایک امیدوار کی عمدہ پیکر تراشی کی ہے۔ دیکھئے آج کا ایک امیدوار ٹکٹ کی دعوے داری کے لیے اپنی کن لیاقتوں کو فخریہ بیان کرتا ہے:

میری سرشت میں داخل ہے چور بازاری — مری بہشت ہے بازار حرص و مکاری
منافع خور بھی ہوں اور سود خوار بھی ہوں — خدا پرست بھی ہوں اور خدا کی مار بھی ہوں
بڑی صفائی سے کر کے ذخیرہ اندوزی — اکال میں بھی مناتا ہوں جشن فیروزی
غرض کہ منبع اوصاف ہے یہ خادم قوم — خدا کے واسطے بھولیں نہ اس کو ناظم قوم

''نظم'' ''ایک اشتہار'' بھی عصری سیاسیات کے اصل چہرے کو آشکار کرتا ہے۔ ''ڈکٹیٹر کا سر'' میں آمرانہ نظام کی بھرپور عکاسی ملتی ہے۔ نظم ''زبان'' میں اسمبلی کے اجلاسوں کے سوال و جواب کی

وہ کیفیت پیش کی گئی ہے، جو سرکاری زبان کی ثقیل اور جدید اصطلاحات میں پھنس کر اپنے مفہوم سے بیگانہ ہوجاتی ہے۔ ''میرے چمچو'' میں خوشامد پرستی اور طوطا چشمی جیسی اخلاقی کمزوریوں پر بھرپور طنز ہے۔ ''فہرست حمار'' میں اعداد و شمار فراہم کرنے کے سرکاری ادارے کو نشانۂ طنز بنایا گیا ہے۔ ''راشن کی دوکان'' میں گرانی اور عوام کی پریشان حالی کو پیش کیا گیا ہے۔ محض ایک شعر میں اس دوکان کا منظر دیکھئے:

گندم کے عوض کشتۂ گندم کا ہے جلوہ
ہر آن یہ خطرہ ہے کہ ہو جائے نہ بلوہ

''اکیسویں صدی کی ولادت قریب ہے''، ''اکیسویں صدی میں عورتوں کا راج''، ''اکیسویں صدی میں آبادی کا حل'' جیسی نظموں میں نئی صدی کا خیر مقدم ہی نہیں مستقبل کے خطرات اور پیچیدگیوں سے متنبہ بھی کیا گیا ہے۔ ان میں سائنس کی ترقی کے اگلے قدم کے بارے میں اظہار ملتا ہے۔ دیکھئے واہی اکیسویں صدی کا کیسا نقشہ دکھاتے ہیں:

کچھ لوگ تو ہیں عازم تسخیر کائنات ہے دل میں ان کے جستجوئے حل مشکلات
ہم ہیں اسیر گیسوئے مفعول و فاعلات
ہوگی نہ ماں پہ خلقت اولاد منحصر جرثومۂ حیات کو نلکی میں ڈال کر
کھٹکا دبا دیا اور برآمد کیا پسر
چنگیز اور ہلاکو و ہٹلر کے جانشیں اسٹار وار کے لیے ہتھیار آتشیں
رو کے ہوئے ہیں سانس نشانے پہ ہے زمیں

غرض ''منظومات واہی'' ایک ایسا مجموعہ ہے، جس میں واہی کی ہر نوع کی ظریفانہ نظمیں مجتمع ہوگئی ہیں۔ ڈاکٹر محسن رضا رضوی نے اس مجموعے پر تبصرہ کرتے ہوئے بجا فرمایا ہے کہ:

''واہی صاحب کی طنزیہ شاعری محض طنز برائے طنز نہیں ہے؛ بلکہ زندگی کی چھوٹی چھوٹی ناہمواریوں پر عالی حوصلگی کے ساتھ ہمدردانہ نگاہ ہے اور اس نگاہ میں جو طنز ہے، وہ جگہ جگہ ظرافت کی نقاب اوڑھے ہوئے ہے۔ واہی صاحب نے کلاسیکل ادب کے وسیع مطالعے سے بھی خوب خوب فائدہ اٹھایا ہے۔ ان کے یہاں میر و غالب و اقبال اور دوسرے بڑے شعرا کے مشہور مصرعوں کا برمحل، برجستہ اور بے تکلف استعمال جہاں قاری کو

مسرت عطا کرتا ہے، وہیں واہی صاحب کی فن پر دسترس کا بھی پتہ دیتا ہے''۔

(ماہنامہ ''کتاب نما'' دہلی، ستمبر ۱۹۹۳ء)

واہی کے مجموعہ ہائے کلام پر ناقدانہ نگاہ ڈالنے سے یہ اندازہ ہوا کہ رضا نقوی واہی عصری ظریفانہ شاعری کا ایک توانا نام ہے۔ اردو کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کی جو ارتقائی منزلیں رہی ہیں، ان کے پیش نظر واہی جیسا دوسرا ان کا مدمقابل کوئی اور طنز و مزاح نگار نظر نہیں آتا۔ وہ ایک رجحان ساز طنز نگار شاعر ہیں، جن کا رویہ ٹرینڈ سٹنگ (Trend Setting) کا ہے۔ واہی اپنی ظریفانہ شاعری میں طنز و مزاح کے تمام اہم تقاضوں کو بطریق احسن بروئے کار لاتے ہیں۔ مثلاً زبان و بیان میں لفظیات کا استعمال، لب و لہجہ میں طنز جو شائستگی کا حامل ہے، مزاح جو قہقہہ بن کر شوریدگی اختیار نہیں کرتا۔ مواد جو طنز و مزاح کو بہ حسن و خوبی اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ بندش کی چستی جو سستی سے مبرا ہے۔ معنوی اور صوری صنعتیں جو برمحل استعمال ہوئی ہیں، متانت، شائستگی اور بے ساختگی جو کلام کو فوری قاری کے دل میں اتار دے۔ یہ تمام اوصاف واہی کے کلام میں بہ درجۂ اتم موجود ہیں۔

واہی کی ظریفانہ شاعری: فکری وفنی جہات

طنز ومزاح نگاری ایک مشکل؛ مگر دلچسپ فن تصور کی جاتی ہے۔ یہ بظاہر دو متضاد فن ہیں؛ مگر حقیقتاً یہ ایک دوسرے سے گہرا رشتہ رکھتے ہیں۔ اس کی کامیابی گہرے سماجی شعور اور فکری بصیرت کی متقاضی ہوتی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ انسانی زندگی خوشگوار حالات وتجربات کی ہی توقع رکھتی ہے؛ تاہم ایسے میں جب معاشرے میں کجی، بے اعتدالی اور مختلف قسم کی ناہمواریاں، انسان کے تجربات کا حصہ بنتی ہیں تو اس کا شعوری ردعمل بھی سامنے آتا ہے، یہ ردعمل کبھی نفرت اور کبھی ہمدردی وترحم کے جذبات کے ساتھ نمایاں ہوتا ہے۔ نفرت اور ہمدردی کے یہی وہ جذبات ہیں، جو الفاظ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو طنز ومزاح کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں؛ تاہم یہاں یہ بھی یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ طنز ومزاح کا یہ اظہار کوئی میکانکی عمل نہیں ہوتا؛ بلکہ انسانی معاشرے اور زندگی کے منفی پہلوؤں کی نشاندہی کر کے اصلاح کی راہیں بھی ہموار کرتا ہے، لہٰذا طنز وہ آرٹ ہے، جو انسانی زندگی کی بدصورتی پر نشتر زنی میں معاون ہوتا ہے تو مزاح زندگی اور معاشرے کے کریہہ زخموں سے فاسد مادّہ کے باہر نکل جانے کے بعد اس پر مرہم بن کر اسے آسودگی اور سکون بخشتا ہے۔ طنز کے سلسلے میں ڈاکٹر وزیر آغا کی رائے ہے کہ:

''طنز زندگی اور ماحول سے برہمی کا نتیجہ ہے اور اس میں غالب عنصر نشتریت کا ہوتا ہے''۔

گویا طنز وہ نشتر ہے، جس میں تلخی، برہمی اور نفرت تیز دھار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس دھار سے طنز نگار زندگی اور معاشرے کے بھدے زخموں پر نشتر لگاتا ہے اور معاشرے اور زندگی میں پائی جانے والی برائیوں، بدعنوانیوں اور خباثتوں کے فاسد مادّے کو باہر نکالنے کی کوشش کرتا ہے، لہٰذا اس میں طنز نگار کے لیے مہارت اور چابک دستی کی بھی ضرورت ہوتی ہے، جو زبان و بیان پر مکمل گرفت کے بغیر ممکن نہیں۔ الفاظ کا بے ربط اور بے موقع استعمال طنز میں پھکڑ پن کو جنم دے سکتا ہے اور قاری کی قوت متخیلہ کو مجروح کر سکتا ہے، چنانچہ ماہرین ادب کا خیال ہے کہ طنز کے بہتر اور لطیف اظہار کے لیے طنز نگار کا ذاتی بغض وعناد اور تعصب کے جذبے سے یکسر پاک ہونا ضروری ہے؛ کیوں کہ طنز نگاری کسی ذاتی دشمنی کا اظہار نہیں؛ بلکہ اس ہمدردانہ جراحت کا نام ہے، جو ایک نرم دل طبیب کی شفقت اور ہاتھوں کے ماہرانہ لمس کی طرح مریض کے ذہن کو سکون اور زخم کو شفا بخشتی ہے؛ اسی لیے طنز کی تلخی کو کم کرنے کے لیے اس میں مزاح کی ہلکی چاشنی کا ہونا بھی ضروری ہے۔ معروف ترقی پسند نقاد پروفیسر سید احتشام حسین نے اسی لیے طنز نگاری کو تلوار پر ناچنے کے عمل سے تعبیر کیا ہے۔

طنز کا جنم آہ وبکا کے بطن سے ہوتا ہے، اس کے برعکس مزاح انبساط ومسرت کا پروردہ ہے۔ اسٹیفن لیکاک کا خیال ہے کہ:

''مزاح نام ہے زندگی کی ناہمواریوں کے اس ہمدردانہ شعور کا، جس کا اظہار فن کارانہ انداز میں ہو جائے''۔

ولیم میک پیس تھیکرے نے کیا خوب کہا تھا کہ:

''مزاح وہ بہترین لباس ہے، جو کوئی شخص معاشرے میں پہن سکتا ہے''۔

سخت گرمی کے بعد خوشگوار بارش کی طرح، اچھا مزاح بھی اچانک ساری کلفت دور کر کے پڑھنے والے کو خوشگوار ٹھنڈک پہنچاتا ہے۔ یہ ایک خاص انداز تحریر ہے، جو آپ کو ہنساتا ہے، یا کم از کم مسکرانے پر ضرور مجبور کر دیتا ہے؛ لیکن جہاں تک مزاح تحریر کرنے کا تعلق ہے، یہ امر محال ہے؛ اس لیے کہ اس میں انسانی کمزوریوں اور کردار کے وہ مکروہ گوشے بے نقاب ہوتے ہیں، جن کا اظہار عام طور پر کسی کو گوارا نہیں، لہٰذا مزاح نگار اپنی کڑوی کسیلی باتوں پر مٹھاس کا خول چڑھاتا ہے؛ تا کہ انہیں ہنس کر برداشت کرنا سب کے لیے آسان ہو جائے۔ مزاح میں پیار، محبت، خلوص اور ہمدردی کی لہریں شامل ہوتی ہیں۔ مزاح نگاری محض صورتوں کے بے ڈھنگے پن پر ہنسنے کا نام نہیں؛ بلکہ اس کی

بہتری کی چاہت اور اس کے لیے محبت کے جذبے کا دوسرا نام ہے۔ سماجی زندگی میں در آنے والی بد اعتدالی، مایوسی، بدصورتی، تنگ نظری، تعصب اور دیگر ناہمواریوں کا تدارک محض طنز کے نشتر سے ممکن نہیں؛ بلکہ اس میں مزاح جیسے ہمدردانہ رویے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں میریڈتھ کا قول مزاح کی صورت کو زیادہ واضح طور پر پیش کرتا ہے:

"کسی ملک کے متمدن ہونے کی سب سے عمدہ کسوٹی یہ ہے کہ آیا وہاں ظرافت کا تصور اور کامیڈی (طربیہ) پھلتے پھولتے ہیں کہ نہیں اور سچے طربیہ کی پرکھ یہ ہے کہ وہ ہنسائے؛ مگر ہنسی کے ساتھ فکر کو بھی بیدار کرے"۔

طنز و مزاح کی تفریق و تمیز سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دونوں الگ الگ حربے ہیں، اس کے باوجود دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ ان دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے، اگر مزاح میں طنز قطعاً شامل نہ ہو تو مقصدیت کے آبگینے کو ٹھیس پہنچتی ہے اور اگر طنز کا عنصر شدید ترین ہو تو جو تخلیق وجود میں آئے گی، اس کی شدت، کاٹ اور کڑواہٹ ناقابل برداشت ہوگی۔ "مزاح" سے اگر طنز کو الگ کر دیا جائے تو محض پھکڑ بازی، یا مسخرہ پن باقی رہ جاتی ہے اور اگر "طنز" میں مزاح شامل نہ ہو تو وہ گالی بن جاتا ہے، یا کسی سفاک قاتل کی مسکراہٹ.... طنز میں مزاح کی ہلکی سی چاشنی ہی شمشیر براں کا کام دیتی ہے۔ یہ علم، یا ہنر سماجی ناانصافیوں اور نامعقول حالات پر نہ تو صرف سرزنش ہے اور نہ ہی محض سرکس کے مسخرے کی سی بوالعجبیاں۔ حد سے زیادہ سنجیدگی اسے خشک اور بے کیف بنا دیتی ہے اور حد سے زیادہ تمسخر فحش گوئی تک پہنچا دیتا ہے؛ اس لیے اس بحر کے شناور کے لیے حد درجہ احتیاط اور توازن کی ضرورت ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور نے درست فرمایا ہے کہ:

"اعلیٰ طنز میں ظرافت اور ادبی حسن دونوں ضروری ہیں۔ خالص ظرافت نشیب و فراز کا احساس دلا کر ایک مسرت و انبساط پیدا کرتی ہے۔ طنز و مزاح میں مسرت اور خوشی ملی جلی ہوتی ہے"۔

طنز و مزاح کے پس پردہ فرد، سماج، یا معاشرہ کی اصلاح کا جذبہ بہر صورت کارفرما ہوتا ہے؛ تا کہ ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل ممکن ہو سکے۔ گویا فرد اور سماج کے متعلق طنز و مزاح نگار کا رویہ خالص اصلاحی اور تعمیری ہوتا ہے۔

اردو شاعری میں طنز و مزاح کے عناصر ابتدائے شاعری سے ہی ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ جعفر

زٹلی سے لے کر موجودہ عہد تک سینکڑوں شعرا نے اس فن کو حسب ضرورت برتنے کی کوشش کی ہے؛ لیکن ان میں سے بعض ایسے ہیں، جنہوں نے اس فن کو اپنی شناخت کا مستقل ذریعہ بنا لیا۔ ایسے ہی فنکاروں میں ایک اہم نام رضا نقوی واہی کا بھی ہے۔ طنز و مزاح کو درجۂ استناد تک پہنچانے اور پھر اسے باقاعدہ ایک کامل فن بنانے والوں میں ان کا نام بہت ہی عزت و احترام کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ بعض اصحاب نظر کا خیال تو یہ ہے کہ رضا نقوی واہی، اکبر الہ آبادی کے بعد دوسرے بڑے طنز و مزاح نگار ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ اکبر کی روایت کو انہوں نے سنجیدگی سے آگے بڑھایا ہے، جس طرح اکبر نے اپنی ظریفانہ شاعری سے معاشرے کی اصلاح کا کام لیا ہے، اسی طرح واہی بھی اپنی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کے ذریعہ فرد و سماج اور ملک و قوم کی بے اعتدالیوں، ناہمواریوں اور خباثتوں کو اجاگر کرتے ہیں؛ تا کہ انہیں اصلاح کا حسین موقع فراہم ہو سکے اور وہ اپنے غلط رویوں اور ناہمواریوں کو پاٹ کر ایک صحت مند معاشرے کی تشکیل میں ممد و معاون بنیں۔

رضا نقوی واہی کا ادراک و شعور بالیدہ اور فکر پر فن اور ذہن رسا ہے، ان کی نگاہیں دور بیں اور دور رس ہیں۔ وہ اپنے گرد و پیش پھیلی ہوئی سماجی، اخلاقی اور معاشرتی زندگی کے صد رنگ جلوؤں کا شعور اور نت نئی تبدیلیوں کا احساس کراتے ہیں۔ عصر حاضر کے سماجی، سیاسی، اخلاقی، تعلیمی اور ادبی مسائل خواہ وہ بداعمالی، یا بدعنوانی؛ یعنی حرص و ہوس، لوٹ کھسوٹ، چور بازاری، قتل و غارت گری، ناانصافی، رشوت خوری، کرپشن، نفس پرستی اور سماجی نابرابری کا معاملہ ہو یا سیاست کی زبوں حالی اور اقتدار کی کشمکش کا، درس و تدریس کے گرتے معیار کی بات ہو، یا شعر و ادب کی بگڑتی قدروں کا، ہر قسم کے مسائل و مراحل ان کے قلم کی زد میں آئے ہیں۔ انہوں نے زندگی کے ہر گوشے پر تنقیدی نظر ڈالی اور اسے طنز و مزاح کا مرکز بنایا۔ میرا خیال ہے کہ شاید ہی کوئی فرد، جماعت، یا پیشہ وران کے فکر و قلم کی جنبش سے بچا ہوگا۔ انہوں نے قوم و ملک اور سماج و معاشرے کے ہر طرح کے نمائندہ کرداروں کو طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔ شاعر، ناقد، محقق، تبصرہ نگار، فلسفی، لیڈر، طالب علم، کامریڈ، ایڈیٹر، ریسرچ اسکالر، مولوی، ملا، لکچرار، پروفیسر، بانیان مشاعرہ، وکیل، عاشق، حکیم، بڑا صاحب، کاتب، خدام ادب، اقتباساتی ادیب، مکتوبی ادیب، ٹیڈی بوائے، ٹیڈی گرل، مئے خوار، مقرر، چور، ماہر فن، واعظ، ڈکٹیٹر، وفاتی، ترقی پسند اور جدید یے وغیرہ وہ خاص کردار ہیں، جن کے حرکات و سکنات اور اعمال و افعال پر واہی نے طنز کے نشتر چبھوئے ہیں اور ساتھ ہی جہاں تہاں ظرافت کے پھول بھی برسائے ہیں۔ ان سب کرداروں کے غلط رویوں اور سماج کی

بے اعتدالیوں، ناہمواریوں اور خباثتوں کو واہی نے طنز کا نشانہ بنایا ہے، جو ہمارے معاشرے اور ملک کے لیے مضر ہیں۔ واہؔی کا کلام اپنے اندر تفنن طبع اور تفکر کا خاصا سامان رکھتا ہے۔

واہؔی کی نگاہ تیز، مشاہدہ وسیع اور تہذیبی و معاشرتی شعور نکھرا اور ستھرا ہے۔ زبان پر انہیں ماہرانہ قدرت حاصل ہے۔ فنی وسائل پر بھی ان کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ کب اور کس پر ہنسنا چاہیے اور کہاں ہنسی سے گریز کرنا چاہیے۔ واہؔی کی ظریفانہ شاعری صرف زیر لب تبسم کا سبب نہیں بنتی ہے؛ بلکہ یہ ہماری دکھتی رگوں پر انگلیاں رکھ رکھ کر ہمیں چپکے چپکے رلاتی بھی ہے۔ اپنی خامیوں کو سامنے رکھ کر دوسروں کو آئینہ دکھانا کوئی آسان کام نہیں۔ اس منزل سے وہی شخص گزر سکتا ہے، جو خود کو نشانہ بنانے کی قدرت رکھتا ہو اور اپنے آپ پر قہقہہ لگانے کے فن سے بھی بہ خوبی واقف ہو۔ واہؔی نے خود اپنے ہی زخموں کو کرید کر قہقہہ لگانے کی جرأت کی ہے۔ اس کی توثیق ان کے شعری مجموعوں کی ورق گردانی سے بہ خوبی ہو جاتی ہے۔

شاعری میں طنز و مزاح کے عناصر کو حسن واثر کے ساتھ برتنا نہایت مشکل کام ہے۔ رضا نقوی واہؔی کی کہنہ مشاقی اس پل صراط سے جھجکے بغیر کامراں گذرتی ہے۔ اعتدال و توازن اس کے ہم رکاب ہوتے ہیں۔ نگاہ اپنی غایت پر ہوتی ہے، اس غایت کے حصول کے وسائل اور مقتضیات ان پر روشن ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کا فن اپنے لطف بیان، لطف واقعہ اور جدت اظہار کی بنا پر قارئین کے لیے کشش اور دلچسپی کا سامان فراہم کرتا ہے۔

واہؔی کا شعری رویہ طنزیہ و مزاحیہ ہونے کے باوجود مسائلی ہے۔ ان کی نظموں میں ملکی اور بین الاقوامی ہر طرح کے مسائل و موضوعات ملتے ہیں، ان مسائل کے بارے میں ان کا مخصوص نقطۂ نظر ہے۔ وہ افراد کی انسانی کمزوریوں پر گرفت کریں، یا ان کی شرارتوں اور حماقتوں پر طنز، معاشرے کی خامیوں کو آشکار کریں، یا غلط منصوبہ بندیوں پر پھبتی کسیں۔ ان کا مقصد اصلاحی ہوتا ہے۔ واہی صاحب کلاسیکی وضعداریوں کے پیکر ہیں؛ اسی لیے وہ نئے معاشرہ کی بے احتیاطیوں کو بالکل نظر انداز نہیں کرتے؛ لیکن ان کی یہ تنقیدیں نفرت اور غصہ کی وضاحت نہیں کرتیں؛ بلکہ ہمدردی اور رواداری کو پیش کرتی ہیں۔ نئی نسل کی بے راہ روی، سماجی و اخلاقی پستی، خاندانی منصوبہ بندی، طلبہ کی انتشار پسندی، بے روزگاری، غذائی اجناس کی کمی، اقتدار کا کھوکھلا پن، سیاست کی ہلاکت خیزی، خود غرضی، ہوس پرستی، ریاکاری، نفس پرستی، تہذیبی سطح پر معاشرے کا دیوالیہ پن، چور بازاری، رشوت ستانی،

کرپشن، ناانصافی، استحصالی رویے، ادب کی بگڑتی قدریں، سماج کے بے تکے اور بے ہنگم عناصر وغیرہ ان کے اہم موضوعات میں سے ہیں۔

واہؔی کا طنز خواہ اپنی ذات کو نشانہ بنائے، یا کسی اور کو، اس کا اصل مقصود کسی کمی کی گرفت ہوتا ہے۔ اس سے کسی انسانی کمزوری، یا سماجی کوتاہی کی طرف توجہ درکار ہوتی ہے۔ غرض اصلاح ہوتی ہے، دل آزاری نہیں۔ اس ضمن میں پروفیسر اختر اورینوی نے بجا فرمایا ہے کہ!

> ''واہی کی ظرافت کا موضوع خواہ فرد ہو، یا معاشرہ، خواہ قوم ہو، یا نوع بشر، پڑھنے والا واضح طور پر یہ محسوس کرے گا کہ فنکار کی ظریفانہ تنقید کا مقصد اصلاح ہے۔ شاعر کو انسانوں سے دلی ہمدردی ہے۔ وہ ان پر ہنستا ہے، اس عالم میں کہ اس کا دل رو رہا ہوتا ہے؛ لیکن وہ ہنسوڑ پن کا قائل نہیں، وہ مردانہ انداز میں اصلاح کی کوشش کرتا ہے اور شرارتوں کے مقابلے میں غضب ناک ہوتا ہے۔ واہؔی کی نظموں میں ہمیں ایک پاکیزہ اور ہمدردانہ خشمگیں انداز بھی ملتا ہے۔ واہؔی کی ظرافت مصلحانہ ہے؛ مگر واعظانہ نہیں، بڑی فنکارانہ ہے، وہ کبھی بھی نصیحتیں کرنے نہیں بیٹھتے؛ بلکہ فنی چابک دستی سے صورت حال پر ظریفانہ تبصرہ کرتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان کا 'انگڑھ پن' دور ہوتا کہ اس کی ہنسی نہ اڑے۔ انسان کا معاشرہ درست ہو جائے؛ تاکہ اس کا انمل، بے جوڑ پن، شیخ چلی پن، خوجی پن، یا اس کی شرارت، خباثت اور ابلیسیت سب فنا ہو جائیں، اس غرض کے لیے واہی اپنی ظرافت کے اسلحہ خانے کے اسلحوں کو نہایت موزوں طور پر استعمال کرتے ہیں۔ کہیں پر ہلکی سوئی چبھوتے ہیں، کہیں نشتر لگاتے ہیں اور کبھی تیر برساتے ہیں؛ لیکن جہاں پر طنز کی ضرورت نہ ہو، وہاں پر صرف مزاح لطیف کی شگفتگی، یا نمک افشانی سے کام لیتے ہیں''۔

(مقدمہ ''نشتر و مرہم'' از: رضا نقوی واہی، ص:۲۲)

بلاشبہ واہؔی کی ظرافت مصلحانہ ہوتی ہے؛ مگر واعظانہ نہیں۔ وہ نصیحتیں نہیں کرتے ہیں؛ بلکہ فنی چابکدستی سے صورت حال کا آئینہ دکھاتے ہیں۔ بطور مثال ''یواین او''، ''قیام امن''، ''ماسٹر پلان''، ''چال''، ''گو ہاتھ میں جنبش نہیں...''، ''لال فیتہ''، ''گرومور فوڈ''، ''بلیڈ''، ''طوق زرّیں''، ''ترقی''، ''ویلفیئر اسٹیٹ''، ''لیڈری کا نسخہ''، ''ایک اشتہار''، ''ہم کون ہیں، ہم کیا ہیں''، ''آبادکاری''، ''الکشن''، ''اپیل''، ''لیلائے کرپشن''، ''رشوت''، ''ملازمت''، ''پیروی''، ''ہم نے چاہا تھا کہ

مرجائیں.....'' ''بلیک مارکیٹیئر''، ''کرفیو''، ''ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق''، ''ٹیڈی کفن''، ''ٹیڈی گرل''، ''معرکہ جہیز و دین مہر''، ''جنرل اسپتال''، ''ریل کا سفر''، ''شہرت کے لیے''، ''ٹیوشن''، ''میں اسٹوڈنٹ ہوں''، ''یلغار سے انتشار تک''، ''مولوی اور کامریڈ''، ''نقاد''، ''محقق''، ''پی ایچ ڈی''، ''تحقیقی مقالہ برائے فروخت''، ''اے لکچرر''، ''پروفیسر نامہ''، ''انٹلکچوئل''، ''تبصرہ نگاری''، ''خدام ادب''، ''حضرت کاتب''، ''گویا شاعر''، ''غالب صدی اور اردو'' وغیرہ جیسی نظمیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ یہ واہیؔ کی کامیاب طنزیہ نظمیں ہیں، ان نظموں میں حقیقت وحسن کا حسین امتزاج موجود ہے۔ ہر نظم ایک ایسے مرکزی تجربہ پر مبنی ہے، جو جذبی اور تخیلی تجربہ بن کر بڑی فنکارانہ ہوگئی ہے۔ ان میں طنز کی گہری سیاسی، سماجی معنویت بنیادی طور پر نمایاں ہے۔

واہی کے موضوعات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ انہوں نے ہمارے دور کی تعلیمی، سماجی، سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی کوتاہیوں کو محسوس کیا ہے؛ اسی لیے ان کی تخلیقات میں سیاسی، تاریخی، سماجی ادراک اور عصری تقاضوں کا احساس موجود ہے۔ آیئے چند نظموں کے بطن میں اترتے ہیں۔ پہلی نظم ''یو این او'' کو لیجئے، اس میں اقوام متحدہ کی کارگزاریوں پر طنز کیا گیا ہے۔ ہم سبھی جانتے ہیں کہ بین الاقوامی مسائل اور حقوق انسانی کے تحفظ کے سلسلے میں یہ تنظیم سرگرم عمل رہی ہے اور اکثر کامیابی سے ہمکنار بھی ہوئی ہے؛ لیکن یہ بھی ایک کڑوا سچ ہے کہ اس کا جھکاؤ ہمیشہ بڑے ممالک، خصوصاً امریکہ کی طرف ہی رہا ہے۔ واہیؔ نے یہاں بندر اور بلیوں کی روایتی کہانی کے پس منظر میں اقوام متحدہ کے کردار پر بڑا گہرا طنز کیا ہے کہ جس پنیر کے ٹکڑے کو لے کر بلیاں آپس میں برسرِپیکار ہیں، انہیں کس حسن تدبر سے بندر اپنی خوراک بنالیتا ہے۔ شاعر کے خیال میں بین الاقوامی سیاسی اسٹیج پر یو این او کا کردار اسی بندر کی مانند ہے جو چند ممالک کے مفاد کی ہمنوائی کرتا ہے:

رہا یہ سلسلۂ عدل دیر تک جاری
کبھی یہ پلہ جھکا اور کبھی وہ پلہ جھکا
تھا بسکہ سعیٔ توازن میں پنجۂ تقسیم
کچھ اس میں سے کبھی نوچا کچھ اس میں سے نوچا
غرض ترازو انصاف ہو گئی خالی
پنیر ختم ہوئی، ختم ہو گیا جھگڑا
فسانہ عدل کا واہی سے سن لیا تم نے
اب اس کے بعد نہ پوچھو کہ یو این او ہے کیا؟

یہاں ''پنجۂ تقسیم'' اور ''ترازو انصاف'' جیسی استعاراتی ترکیبوں کے ذریعہ یو این او کا پردہ

فاش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ نظم ''قیام امن'' بظاہر ان سامراجی قوتوں کے خلاف ہے، جو ویتنام کو نیست و نابود کرنے کے درپے ہیں؛ لیکن بباطن شاعر کے طنز کا رخ دنیا میں ایٹمی جنگ چھڑ جانے کے اندیشے کی طرف ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

یہ جو اس کی نبض میں باقی ہے ہلکی سی دھمک
جان لے یہ بھی بڑا خطرہ ہے تیری راہ کا
فکر ایسی کر کہ اب یہ درد سر بھی دور ہو
خود تری دوکان میں ملتی ہے ''اکسیر الشفاء''
ہے مریض امن کو حاجت اسی تریاق کی
کام کب آئے گی آخر جوہری بم کی دوا

واہیؔ ''اکسیر الشفاء'' یعنی ایٹم بم کی طرف بلیغ اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ دراصل ان تمام اقوام عالم کے لیے ہے، جنہیں امریکہ اور اس کے حواریوں نے جاں کنی میں مبتلا کر رکھا ہے۔

واہی کی نظم ''ماسٹر پلان'' پنج سالہ منصوبوں کے پس منظر میں مہنگائی پر طنز کی عمدہ مثال ہے۔ چھ اشعار پر مشتمل اس مختصر سی نظم میں نہایت جامعیت و بلاغت کے ساتھ سرکاری منصوبہ بندی اور اس کے نتائج کو آشکار کیا گیا ہے۔ ملک کی ترقی اور خوشحالی کے لیے بنائے گئے یہ ماسٹر پلان اور عوام کی ترقی پذیر خستہ حالی آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

میں ہر طرح سے خرم و آسودہ حال تھا
جس وقت ابتدا ہوئی پہلے پلان کی
جاپانی طرز کاشت کا ہوتا گیا فروغ
قیمت بھی ساتھ ساتھ بڑھی جو کی، دھان کی
جب دوسرا پلان چلا زور و شور سے
ہر شئے فروخت ہو گئی اپنے مکان کی
اور تیسرے پلان کے عرصے میں رات دن
مٹی میں ساکھ ملتی رہی خاندان کی
چوتھا پلان جلد ہی ہونے کو ہے شروع
اب کے نہ تن کی خیر ہے اپنے نہ جان کی
سندری کے کارخانے میں ختم پلان تک
تیار ہوگی کھاد مرے استخوان کی

نظم ''ترقی'' میں حکومت کے ترقیاتی منصوبوں کے کھوکھلے پن کو اجاگر کیا گیا ہے۔ ''لال فیتہ'' اور ''گرومور فوڈ'' میں سرکاری مہم اور دفتر کی کاغذی خانہ پوری کو پر اثر انداز میں موضوع بنایا گیا ہے۔ نظم ''چال'' حکومت اور اس کی عوام کے تئیں بے حسی؛ بلکہ مکاری کی طرف طنزیہ وار کرتی ہے کہ کس طرح مسائل سے چشم پوشی کی جاتی ہے اور اس کے پیچھے کیا مقاصد کارفرما ہوتے ہیں۔ روٹی کا سوال، پیٹ کی

آگ اور غلے کی کمی جیسے مسائل دراصل اسی لیے حل نہیں کئے جاتے کہ عوام کا استحصال جاری رہے اور اپنے ہاتھ گرم کئے جا سکیں۔ جذباتی احساسات سے پر یہ نظم طنز کی عمدہ مثال ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

اپنا مقصد تو اسی شکل سے حاصل ہوگا   کہ یہاں اور بھی پیچیدہ ہو روٹی کا سوال
پیٹ کی آگ اسی طرح سے سلگے دن رات   چولہے ٹھنڈے رہیں سستا نہ ہو چاول اور دال
ملک اور قوم میں گھٹتا رہے ایمان کا بھاؤ   شہر اور گاؤں میں بڑھتا رہے غلے کا اکال
پھولتی جائے بتدریج مہاجن کی توند   اور پچکتے رہیں مزدور کے بچوں کے گال

نظم ''گو ہاتھ میں جنبش نہیں...'' میں بھی حکومت کی سرد مہریوں اور بے اعتدالیوں پر طنزیہ وار کئے گئے ہیں۔ طنز کی کاٹ سے لبریز اس نظم میں ان خامیوں اور کوتاہیوں کو نشان زد کیا گیا ہے، جو اس چند روزہ حکومت سے منسوب ہیں۔ سابق وزیر اعظم ''مرار جی ڈیسائی'' کو ذہن میں رکھتے ہوئے ان اشعار سے لطف اٹھائیے:

دو سالوں میں کیا کیا نہ تماشہ نظر آیا   ہر دوش پہ اقدار کا لاشہ نظر آیا
باپو کی سمادھی پہ جو کھائی گئیں قسمیں   دو دن میں بھلائی گئیں کرسی کی ہوس میں
آزادیٔ نو کا تھا لبوں پر جو سلوگن   ہر دل میں تھرکنے لگی لیلائے کرپشن
باقی نہ رہا نام و نشاں امن و اماں کا   جو حال مدن کا تھا وہی نور میاں کا
'دل بدلی' میں حاصل ہوئی اس درجہ مہارت   یاروں نے بنا ڈالا اسے قومی تجارت
اس دور کی تاریخ ہے بے مثل و یگانہ
اس دور کی دریافت ہے ''مشروب مثانہ''

سیاسی موضوعات میں ایک اہم موضوع رہنماؤں کے کردار اور ان کے قول و عمل کے تضاد کے بیان سے تعلق رکھتا ہے۔ واہیؔ نے متعدد نظموں میں ان نام نہاد لیڈران قوم کو اپنا ہدف بنایا ہے۔ آزادی سے قبل ہمارے قومی رہبروں کا جو منصب و معیار تھا اور جس طرح کے مخلص، خلیق، ہمدرد، خدمت گذار اور محبّ وطن لیڈران ہمارے درمیان موجود تھے، آج کے نام نہاد رہنماؤں میں ان کا شائبہ بھی نظر نہیں آتا؛ بلکہ اس کے برعکس یہ لوٹ کھسوٹ، مکر و فریب، شعبدہ بازی و عیاری، منافقت، اقربا پروری، فرقہ پرستی، ذات پات، بدعنوانی و بداعمالی میں زیادہ ملوث نظر آتے ہیں۔ ملک میں قومی رہنماؤں کا حال و احوال، فعل و کردار کسی سے پوشیدہ نہیں۔ واہی کی نظمیں ''نئے لیڈر کی دعا''، ''ایک اشتہار''،

''اپیل''، ''لیبر لیڈر''، ''لیڈری کا نسخہ''، ''ہم کون ہیں، ہم کیا ہیں''، ''آبادکاری''، ''نیا ہاتھی''، ''ڈکٹیٹر کا سر''، ''الیکشن'' وغیرہ عصر حاضر کے لیڈران قوم کی کارکردگیوں و کارگذاریوں کی آئینہ سامانی کرتی ہیں۔

آج کے دور میں ایک لیڈر کے لیے جن اوصاف حمیدہ کی ضرورت ہوتی ہے، واہیؔ نے اپنی نظم ''لیڈری کا نسخہ'' میں ان کا بیان نہایت طنزیہ انداز میں کیا ہے۔ دراصل یہ وہ اوصاف ہیں، جنہیں اخلاقی دنیا کے لوگ برائی کے خانے میں رکھتے ہیں؛ لیکن حقیقتاً یہی اوصاف قائدین کی بلند پروازی اور ترقی و خوشحالی کے ضامن بن گئے ہیں۔ لیڈری کے لیے واہیؔ کیا نسخہ تجویز کرتے ہیں؟ آپ بھی دیکھئے:

تخم ریا کو عقل کے کانٹے پہ تول لیں   سازش کا زہر، شہد فصاحت میں گھول لیں
سچ میں سفید جھوٹ کا پانی ملائیں پھر   حرص و ہوس کی آنچ پہ سب کو پکائیں پھر
قند سیاہ فرقہ پرستی ملائیں پھر   اور کوشش ضعیف کو اپنی کھلائیں پھر
انڈے بھی کچھ حسد کے ہوں لحم خودی کے ساتھ   دونوں کو کھائیں بغض و عداوت کے گھی کے ساتھ

واہیؔ نے یہاں لوگوں کو فکر معاش سے نجات پانے کے لیے لیڈری کا مشورہ دیا ہے، جو کہ اپنے آپ میں خود ایک گہرا طنز ہے۔ علاوہ ازیں انہوں نے نسخہ کی تفصیلات کے بیان میں جن لفظیات و اصطلاحات کو استعمال کیا ہے، اس سے بھی ان کی عمق فکر کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

جمہوری نظام حکومت میں الکشن کی اہمیت و افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ انتخابات کے ذریعہ ہی عوام کی پسندیدہ حکومت کا قیام عمل میں آتا ہے؛ لیکن فی زمانہ الکشن 'جس کی لاٹھی اس کی بھینس' کی مثال بن کر رہ گیا ہے۔ اب الکشن بدعنوانی، مکاری و عیاری اور زور آزمائی کے ہی سہارے جیتے جاتے ہیں۔ جب انتخاب کا موسم آتا ہے تو عیار و مکار کھدر پوش عوام کو ورغلانے پہنچ جاتے ہیں۔ گویا شیطان بھی اس موسم میں انسان کا روپ دھار لیتا ہے۔ جلسے، جلوس، وعدے، قسمیں، خدمت گذاری کا حلف، رائے دہندگان کو متاثر کرنے کے متعدد ہتھکنڈے، ووٹروں کی خرید و فروخت، زور زبردستی اور تشدد، غرض ہر طریقے سے وہ اپنے حق میں ووٹ حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہر وہ لیڈر جو الکشن کے بعد نیل کنٹھ کی طرح غائب ہو جایا کرتا ہے، الکشن کے وقت وارد ہو کر اس قدر عوامی بن جاتا ہے کہ عوام بھی شرما جاتے ہیں اور پھر عوام کے لیے فیصلہ کرنا نہایت مشکل ہو جاتا ہے کہ کس کے حق میں رائے دہی کا استعمال کیا جائے۔ واہیؔ کی نظم ''الکشن'' انتخابات کے ماحول کی کامیاب عکاسی کرتی ہے۔ زبان و بیان کی صلابت اور قافیوں کی ندرت نے نظم کے حسن میں اور بھی اضافہ کر دیا ہے۔ بطور مثال چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

پھر اک نئے الکشن کا آ چلا زمانہ | پھر لیڈروں کے لب پر جنتا کا ہے ترانہ
تقدیر کے جواری عشرت کدوں سے نکلے | کھلنے لگا سیاست کا پھر قمار خانہ
پھر نرم ہو رہا ہے نیتاؤں کا رویہ | پھر گرم ہو رہا ہے باتوں کا چانڈو خانہ
جتنے بلیکئے تھے، بگلا بھگت بنے ہیں | ملتے ہیں ووٹروں سے جا جا کے فدویانہ
بھوکوں کو مل رہی ہے وعدوں کی گرم روٹی | حلوے سے کم نہیں ہے الفاظ مشفقانہ

آزادی کے بعد ہمارے سماجی حالات بھی تیزی سے تبدیل ہوئے۔ سیاسی آزادی کے ساتھ ساتھ مختلف شعبہ ہائے زندگی میں بھی آزادی کا احساس پیدا ہوا۔ سماج و معاشرے کے ہر شعبہ میں تبدیلی کے آثار نظر آنے لگے۔ اب ملک کی باگ ڈور ''دیسی'' لوگوں کے ہاتھ میں تھی۔ آزادی کا یہ احساس اپنی انتہا پر پہنچا تو عقائد، اقدار، نظریہ ہائے حیات بھی اس سے متاثر ہوئے اور ایک ایسا سماج وجود میں آیا، جس کی بنیاد آزادی اور اس کے ناجائز استعمال پر رکھی گئی تھی، لہٰذا وہ خواب جو آزادی سے قبل دیکھے گئے تھے، ٹوٹتے بکھرتے نظر آنے لگے۔ خودغرضی، عیاری، مکاری، موقع پرستی اور استحصال سے پر سماج کی بنیاد نے انسان پر بڑے برے اثرات مرتب کئے۔ کرپشن، بے ایمانی، چوری، رشوت خوری، چور بازاری، سرمایہ داری، غربت، ملاوٹ، نوکر شاہی کے ظلم و ستم، مہنگائی، آبادی، خاندان کا بکھراؤ، اکیلاپن، مذہبی بنیاد پرستی، فسادات، زبان کے ہنگامے، یہ وہ مسائل ہیں جن سے ہمارا سماج اور فرد دوچار ہوا ہے۔ واہی کی نظر اپنے ماحول پر پوری طرح مرکوز رہتی ہے اور وہ اس کی جملہ نیرنگیوں اور بوالعجبیوں کو فنکارانہ مہارت کے ساتھ پیش کرنے کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ آج ہمارے سماج میں ''کرپشن'' کا عمل دخل اتنا زیادہ ہے کہ کوئی شعبۂ حیات اس سے محفوظ نہیں۔ بے ایمانی اور خودغرضی کا دور دورہ سا ہے اور اس کا علاج بھی بظاہر نظر نہیں آتا۔ واہی کی نظم ''لیلائے کرپشن'' براہ راست ''کرپشن'' کو موضوع بناتی ہے۔ انہوں نے کرپشن کو موضوع بنا کر، اس کی زلفوں میں پورے ملک کو الجھا ہوا دکھایا ہے۔ چہار جانب اسی لیلیٰ کی دھوم ہے، لوگ نہ صرف اس کے گرویدہ ہیں؛ بلکہ ہمہ دم اسے اپنانے کو بے چین نظر آتے ہیں۔ معمولی کلرک سے لے کر افسر اعلیٰ اور ارباب سیاست تک سبھی اس کی زلفوں کے اسیر ہیں۔ واہی یہاں در پردہ اس پورے سماج پر طنز کرتے ہیں، جو کرپشن میں مبتلا ہو کر اخلاقی و ثقافتی سطح پر روبہ زوال ہیں۔ اظہار بیان کی ندرت کے ساتھ عشق کے تلازمے کو بروئے کار لا کر شاعر نے نظم کے حسن میں چار چاند لگا دیا ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

ویسے تو پھنسانے میں وہ مشاق بڑی ہے | ہر شخص پہ، ہر دل پہ نظر اس کی گڑی ہے
جی جان سے لیکن وہ دفاتر پہ پڑی ہے
اس دشمن ایماں نے کسی کو بھی نہ چھوڑا | جو اس کے مقابل تھے غرور ان کا بھی توڑا
دل اپنی طرف قوم کے لیڈر کا بھی موڑا
جو دیش کے سیوک تھے اہنسا کے پجاری | خود ان سے حسینہ نے کہا میں ہوں تمہاری
اور ان پہ بھی الفت کا جنوں ہو گیا طاری
اب دیش کی سیوا کی بھلا کیا ہے ضرورت | اب وقت کہاں ہے جو کریں قوم کی خدمت
اب وہ ہیں اور اس شوخ کی آغوش محبت

موجودہ معاشرے میں رشوت کی گرم بازاری ہے، اس کے بغیر آج کوئی بھی کام ممکن نہیں۔ نوکری، کاروبار، سرکاری دفاتر سے لے کر اسکول اور کالجوں میں بچوں کے داخلے کے معاملے میں بھی آج رشوت کا بول بالا ہے، جس کے پاس انسان کو خریدنے کے لیے رقم موجود ہے، وہ کوئی بھی کام بہ آسانی کروا سکتا ہے۔ واہی نے اپنی نظم ''رشوت'' میں رشوت کے ذریعے حل کئے جانے والے مسائل کو قلمبند کیا ہے۔ موضوع کی سنجیدگی لہجے کو کسی حد تک کڑوا کر دیتی ہے، مگر پھر بھی طنز کا منصب مجروح نہیں ہوتا:

رشوت کو برا کہتے ہیں ارباب حماقت | کلجگ میں نہیں اس سے بڑی کوئی صداقت
قاتل کو بچا لیتی ہے پھانسی کی سزا سے | اللہ کی رحمت ہے یہ اللہ کی رحمت
انصاف کا پلہ یہ جدھر جائے جھکا لے | مٹھی میں لیے رہتی ہے میزان عدالت
اعجاز ہے اعجاز ہے رشوت کا اشارہ | اللہ رے اللہ رے رشوت کی کرامت
سونے کا کلس مسجد جامع پہ چڑھے گا | سنتے ہیں کہ ایک سیٹھ نے مانی ہے یہ منت
یہ سچ ہے کہ رشوت کی رسائی ہے وہاں تک | یہ سچ ہے تو اللہ بھی ہے بندۂ رشوت

نظم ''ملازمت'' بھی ایک واقعاتی پس منظر میں سفارش پر طنز کرتی ہے۔ ایک نوکری کے لیے ہوئے انٹرویو میں ایک اہل امیدوار کے بالمقابل ایک سفارشی امیدوار کی تقرری محض اس دست غیبی؛ یعنی سفارش کی بدولت ہو جاتی ہے۔ اہل امیدوار ہمیشہ انٹرویو کے مراحل سے بہ حسن و خوبی گذرتا ہے؛ لیکن تقرر کے وقت:

ہر بار یہ ہوا کہ کوئی فون آ گیا | گھر سے کسی مدبر با اختیار کے
ان کا کوئی عزیز، کسی دوست کا پسر | چکر میں پڑ گیا تھا غم روزگار کے

درخواست تک نہ دی تھی مگر حکمِ خاص سے زمرے میں لے لیا گیا امیدوار کے
انٹرویو بغیر تقرر بھی ہو گیا ہم خواب دیکھتے ہی رہے اقتدار کے
اس دھاندلی کے دور میں ذی علم کیا کریں
بیچیں اگر نہ تیل امنگوں کو مار کے

مذکورہ نظم ایک اور سماجی مسئلہ پر طنز یہ وار کرتی ہے، یہ مسئلہ بے روزگاری کا ہے۔ یہاں واہیؔ کی ایک اور نظم کا ذکر ضروری ہے، اس نظم کا عنوان ''پیروی'' ہے، جس میں انہوں نے بظاہر پیروی کے فوائد گنوائے ہیں؛ مگر بہ باطن اس سماجی لعنت پر تیکھا طنز کیا ہے۔ آج زندگی کے میدان جنگ میں پیروی نام کا اسلحہ ہی کارآمد ہے۔ ملاحظہ فرمائیں:

ہر ہر قدم حیات کا میدان جنگ ہے اور پیروی کا اسلحہ سامان جنگ ہے
تعلیم گاہ شہر میں لڑکوں کا داخلہ بے پیروی کے آج ہے دشوار مرحلہ
جب تک کسی وزیر کا خط لے نہ جایئے ہیڈ ماسٹر کے روم میں گھسنے نہ پایئے
چھوٹی ہو یا بڑی ہو کوئی بھی ہو نوکری ناممکن الحصول ہے جز دست پیروی
چلتی ہے پیروی سے تجارت بھی آج کل ملتی ہے پیروی سے وزارت بھی آج کل

واہیؔ نے دیگر سماجی برائیوں مثلاً: چور بازاری، منافع خوری، بے ایمانی، مہنگائی، ذخیرہ اندوزی، بلیک مارکیٹنگ، اسمگلنگ، ملاوٹ وغیرہ پر بہت بے باکی سے نشتر زنی کی ہے۔ اس سلسلے میں ''ہم نے چاہا تھا کہ مرجائیں۔۔''، ''بلیک مارکیٹ''، ''بلیک مارکیٹیر''، ''راشن کی دوکان'' وغیرہ جیسی نظمیں دیکھی جاسکتی ہیں۔

واہیؔ نے اپنی نظم ''ترقی'' میں ملک کی نام نہاد ترقی پر بلیغ طنز کیا ہے، جو بقول ارباب سیاست ملک وقوم کو سرخرو بنا رہی ہے؛ مگر در پردہ بدعنوانی اور بے ایمانی کا شکار ہو کر ملک کو کھوکھلا کر رہی ہے۔ منصوبہ بندیوں اور ترقی کے پروگراموں کی آڑ میں روپیہ کمانے اور عوام کو بے وقوف بنانے والوں پر یہ نظم بھرپور طنز کرتی ہے۔ ذاتی مفاد پرستی کے رجحان پر اس کا وار کاری ہے:

دیکھئے کتنی ترقی پہ ہے قومی کردار ہم ہوئے، آپ ہوئے، یار ہوئے یا اغیار
ہیں سبھی غمزۂ محبوب کرپشن کے شکار

نظم ''بلیڈ'' ملک کی اسٹیل انڈسٹری کی کارگزاریوں پر بھرپور طنز ہے۔ صرف ایک بند ملاحظہ ہو:

جب اک بلیڈ بھی ہم کام کا بنا نہ سکیں تو فتح عالم امکاں کا خواب کیا دیکھیں

بلیڈ کی یہ خرابی تو اک علامت ہے کہ کس ڈگر پہ رواں کاروانِ صنعت ہے

فرقہ پرستی اور خصوصاً ہندو مسلم فسادات برصغیر کا ایک ایسا ناسور ہے، جو غالباً اب لاعلاج ہو چکا ہے۔ یوں تو اس کی ابتدا انگریزوں کے دور اقتدار میں ہی ہو گئی تھی؛ مگر آزادی کے ساتھ فرقہ پرستی اور مذہبی عصبیت کا زہر جیسے پورے برصغیر کی نفسیات کا اہم حصہ بن گیا ہے۔ مذہب، فرقہ، زبان، علاقائیت جیسے مسائل نے مستقل صورت اختیار کر لی ہے۔ دہشت گردی اور انتہا پسندی کے جراثیم چہار جانب پھیلے ہوئے ہیں۔ فسادات کے موضوع پر واہی کی ایک کامیاب طنزیہ نظم ''کرفیو'' ہے، جس میں کرفیو کی لعنتوں پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ کرفیو کے دوران شہر کو غنڈوں کے حوالے کرنے اور دوکانوں کو لوٹنے اور جلانے میں قانون کے رکھوالوں کی معاونت کے ذکر نے اسے صداقت سے قریب تر کر دیا ہے:

دہشت سے شریفوں کا برا حال ہے گھر میں کرفیو میں ہوا شہر لٹیروں کے حوالے
قانون کے رکھوالے بھی ہمراہ ہیں ان کے آسانی سے توڑے گئے دوکانوں کے تالے
جھلسی ہوئی لاشوں کی جو تصویر چھپی ہے ان میں کئی اطفال بھی ہیں گھنگھروؤں والے
ہے بے گنہی زد میں تشدد کی کچھ ایسے منہ اپنا اہنسا ہے گریبان میں ڈالے
جب کھیل ہوا ختم بنی امن کمیٹی رکھے گئے چن چن کے سبھی لوٹنے والے
اسباب فسادات پہ اب خوب چھپیں گے
اخبار رسائل میں مضامین و مقالے

واہی نے ایک اور نظم بعنوان ''ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق'' میں زبان کی بنیاد پر برپا کئے گئے ایک فساد کی تصویر کشی کی ہے۔ شاعر کا خیال ہے کہ جو مسئلہ دانش کدوں میں طے ہوسکتا ہے، اسے اہل سیاست اپنے ذاتی مفاد کے لیے سڑکوں پر لے آتے ہیں اور پھر اس کی آڑ میں قتل وغارت گری کا تانڈو شروع ہو جاتا ہے۔

کسی بھی ملک اور قوم کی ترقی اس کے تعلیمی معیار سے وابستہ ہوتی ہے، جس قدر تعلیم کا معیار بلند اور اعلیٰ ہوگا، ویسا ہی ہمارا ملک اور ویسا ہی ہمارا سماج ہوگا۔ آج ہمارے یہاں تعلیم کا وہ بلند معیار نہیں رہا، جو قدیم زمانہ میں مدرسوں اور گروکلوں میں پایا جاتا تھا۔ تعلیم اور نظام تعلیم میں متعدد خامیاں راہ پا گئی ہیں۔ واہیؔ کی نظم ''میں اسٹوڈنٹ ہوں''، ''اے لکچرر''، ''ٹیوشن''، ''پروفیسر''، ''پروفیسر نامہ''، ''نئی یونیورسٹی''، ''انٹرویو''، ''پی ایچ ڈی'' اور ''تحقیقی مقالہ برائے فروخت'' کے مطالعے سے ملک کے نظام تعلیم

کی بگڑتی ہوئی صورت حال، اسکول و کالجوں کی ابتری، تعلیم کے گرتے ہوئے معیار، اساتذہ کی بے عملیاں، طلبہ کی بے اعتدالیاں، تعلیم سے ان کی بے توجہی، بے روزگاری، مقابلہ آرائی، رشوت، سہل انگاری، پیروی اور اقربا پروری وغیرہ کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ واہی نے اپنی نظم ''میں اسٹوڈنٹ ہوں'' میں آج کے طالب علم کا خاکہ خود ان کے ہی الفاظ میں پیش کیا ہے، یہ طلبہ جو کہ صلاحیتوں کے معاملے میں تقریباً ناکارہ ہیں، ملک وقوم پر ایک لاینحل مسئلہ بن کر سوار ہیں۔ موجودہ اسٹوڈنٹس حصولِ علم کے بجائے سیر وتفریح اور عیش وعشرت کے مشغلوں میں زیادہ منہمک نظر آتے ہیں۔ یہ طلبہ آزادی کے تصور سے نابلد ہیں اور آزادی کے نام پر تمام تر پابندیوں سے مبرا ہیں۔ نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

مسلط ہوں میں سر پر قوم کے وہ مسئلہ بن کر　　کہ جس نے ہوش غائب کر دیا ہے ہر مدبر کا
مجھے سوراج نے بخشا ہے آزادی کا پروانہ　　اگر پابند ہوں کچھ تو فقط قید عناصر کا
طبیعت میری ہر قید تعلق سے ہے بیگانہ　　نہ گھر کا ہوں، نہ کالج کا، نہ مسجد کا، نہ مندر کا
سوا پڑھنے کے ہر اس کھیل میں رہتا ہوں میں آگے　　کہ جس میں ناطقہ ہو بند شاطر سے بھی شاطر کا

نظم ''اے لکچرر'' میں یوں تو تخاطب لکچرر سے ہے، مگر طنز کا ہدف طالب علم ہیں۔ واہی لکچرر سے کہتے ہیں کہ تو ان بھٹکے ہوئے نوجوانوں کو لاکھ راہ مستقیم پر لانے کی کوشش کرلے، کامیاب نہیں ہو پائے گا؛ اس لیے انہیں قسمت کے سہارے چھوڑ دے؛ کیوں کہ ان کی بے راہ روی، بے شرمی اور بدتہذیبی کا کوئی علاج نظر نہیں آتا؛ کیوں کہ یہ خود بھی اصلاح کی راہ پر گامزن ہونے کو آمادہ نہیں ہیں۔ اس نظم میں طلبہ کی عادات واطوار اور کالج میں ان کے شب وروز پر خوب طنزیہ وار کئے گئے ہیں۔ صرف ایک بند ملاحظہ ہو:

اے لکچرر، اے لکچرر
تو طالبان علم کو قسمت پہ ان کی چھوڑ دے
بنچیں جو خالی تھیں وہ ہیں، ٹیچر جو حیراں تھے وہ ہیں
دوران میں لکچر کے جو لڑکے غزل خواں تھے، وہ ہیں
بہروپ میں انسان کامل کے جو حیواں تھے، وہ ہیں
وحشت منظّم ہو گئی باقی جو ساماں تھے، وہ ہیں

نظم ''ٹیوشن'' میں ان اساتذہ کرام کو ہدف بنایا گیا ہے، جو اسکول و کالج میں پڑھانے سے تو اجتناب کرتے ہیں؛ مگر ٹیوشن پڑھانے پر خوب زور دیتے ہیں۔ ان کی منشا زیادہ سے زیادہ روپیہ کمانے

کی ہوتی ہے۔ واہی کہتے ہیں کہ ایسے اساتذہ ٹیوشن کے معاملے میں بھی زیادہ ایماندار نظر نہیں آتے، وہ طلبہ کو پڑھانے کے بجائے پیپر آؤٹ کرا دینے، نیز ممتحن حضرات سے پیروی کر کے اپنے طلبہ کو امتیازی نمبر دلوا دینے پر زیادہ یقین رکھتے ہیں۔ اس سے ان کی جیب بھی گرم ہوتی رہتی ہے۔ ایسے اساتذہ کرام اپنے مقدس پیشے کی توہین ہی نہیں کرتے؛ بلکہ نااہل اور نکمے طلبہ کو پاس کرا کے قابل طلبہ کے ساتھ ناانصافی کے مرتکب بھی ہوتے ہیں۔

یونیورسٹیوں میں ریسرچ اور اس کی صورت حال، خاص کر پی ایچ ڈی کے لیے کی جانے والی تحقیق وتنقید کے گرتے ہوئے معیار اور اس کے پس پشت کی جانے والی سفارش وسودے بازی کا پردہ فاش واہی نے خوب کیا ہے۔ موضوع کے انتخاب سے لے کر ممتحن حضرات کی خدمات تک، ایک ریسرچ اسکالر کو جن مراحل سے گذرنا پڑتا ہے، اس کی تفصیل ہمیں ان کی نظم ''پی ایچ ڈی'' میں ملتی ہے۔ ابتدا میں شاعر موضوع کی مہملیت پر اظہار خیال کرتا ہے کہ کس طرح عجیب وغریب موضوعات، مثلاً درد کے مزار پر جلنے والے دیوں کی تعداد، یا میر کی چٹائی کا طول وعرض تحقیق کے لیے منتخب کئے جاتے ہیں، یا پھر:

اک دن کسی کباڑی کی دوکاں پہ جائیے　　قلمی کوئی کتاب وہاں سے اڑائیے
کوشش رہے کہ ہو کسی شاعر کا وہ کلام　　گر مل گیا تو آپ کا ہے ختم نصف کام
تخیل کی مدد سے فسانے تراشئے　　ہر اک ورق پہ ٹانکئے دو چار حاشئے
پچھلے محققین کی دو اک کتاب سے　　تمہید نقل کیجئے لیکن حساب سے
ان کا مواد ہو مگر اپنا بیاں رہے　　اقوال دوسرے کے ہوں اپنی زباں رہے

مقالہ داخل کرنے کے بعد کے مراحل بھی کم مشکل نہیں۔ واہی ان پر طنزیہ پیرائے میں اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

پہنچے جو یوں صحیفہ نو تا بہ اختتام　　ہے اس کے بعد مرحلۂ سجدہ و سلام
یعنی کہ بیچ میں ہوں جوار باب حل وعقد　　جھک جھک کے سجدے کیجئے پیش ان کو نقد نقد
بچوں کو ان کے جا کے سنیما دکھائیے　　باتیں ہوں ان کی خشک تو مکھن لگائیے
تیور کو ان کے تولئے اپنی نگاہ میں　　بچھئے چٹائیوں کی طرح ان کی راہ میں
ہر فرق علم و جہل کا معدوم ہو گیا
کیں جس نے خدمتیں وہی مخدوم ہو گیا

آخری شعر میں طنز کی بلاغت محسوس کیجیے کہ پروفیسروں کی خدمت انجام دینے والے کو ہی پی ایچ ڈی کی ڈگری نصیب ہو پاتی ہے۔ واہؔی کے طنز کا وار ایک طرف تو ریسرچ اسکالر کا استحصال کرنے والے پروفیسران پر ہے اور دوسری طرف وہ ریسرچ اسکالرز بھی ان کی زد میں ہیں، جو اپنی صلاحیتوں میں اضافہ کرنے کے بجائے پروفیسروں کو خوش کرنے اور ان کی خدمت انجام دینے میں وقت گنواتے ہیں اور اس طرح تحقیق و تنقید کا سا اہم ترین علمی کام بھی بدعنوانی، بے ایمانی، سہل انگاری کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔ نظم ''تحقیقی مقالہ برائے فروخت'' بھی ایسے ہی موضوعات کا احاطہ کرتی ہے۔ یہاں دراصل ان پروفیسران کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے، جنھوں نے ''پی ایچ ڈی'' کو کاروبار کا ذریعہ بنالیا ہے۔ یہ ایسے طلبا کا انتخاب کرتے ہیں، جن کی اہلیت کلرک بننے کی بھی نہیں ہوتی، ان سے مقررہ رقم وصول کر کے ان کے بدلے نگراں حضرات خود مقالہ تحریر کر دیتے ہیں اور یہی نہیں، ڈگری دلانے کے سارے جتن بھی کر ڈالتے ہیں اور اس طرح ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے وقار کو مجروح کرتے ہیں۔ طنز کا وار ملاحظہ فرمائیں:

ایسے ایم اے پاس لڑکوں کی بھی قسمت کھل گئی — اہلیت جن کی کلرکوں کے برابر بھی نہ تھی
ان کو نقلی ڈاکٹر بننا سکھانے کے لیے — خود مقالے لکھ کے پی ایچ ڈی بنانے کے لیے
فیس استادوں نے رکھی، فی مقالہ دس ہزار — جس سے سودا پٹ گیا، بیڑا ہوا جھٹ اس کا پار
اکسٹرنل ممتحن کے پاس جب تھیسس گئی — پیروی جا جا کے اس کے گھر پہ خود گائڈ نے کی
وائیوا کے واسطے آیا جونہی اکزامنر — ہوٹلوں میں اس کو کھلوایا گیا لنچ اور ڈنر
ہو کے ممنونِ کرم اس کو وہی کرنا پڑا — حضرت استاد نے جو کچھ اشاروں میں کہا
کس نے تحقیقی مقالہ لکھا، کس کے نام سے — کون دلّی جا کے پوچھے گا یہ مالک رام سے

واہؔی نے پیروڈی نگاری میں بھی اپنی انفرادیت کے نقوش چھوڑے ہیں، اس فن میں انھوں نے بڑی ذہانت، جدت طبع اور پختہ فنی کا ثبوت دیا ہے۔ واہؔی پیروڈی کرتے وقت، دلاور فگار کی طرح اس کے فنی پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہیں۔ وہ اپنی پیروڈی میں طنز و مزاح، دردمندی اور اصلاحی عناصر کے خوبصورت امتزاج سے ایک ایسا تاثر تخلیق کرتے ہیں، جو خیال آفریں ہوتا ہے۔ رضا نقوی واہؔی نے نظیر اکبرآبادی کے ''آدمی نامہ'' کو اپنے مخصوص و منفرد انداز بیاں سے بالکل بدل ڈالا ہے۔ انھوں نے اس نظم کی پیروڈی کے لیے ''لکچرر'' کی ذات کو موضوع بنایا ہے اور اس رعایت سے اس کا عنوان ''پروفیسر نامہ'' تجویز کیا ہے۔ نظم طویل ہے، یہاں صرف ایک بند پیش ہے:

ڈی لٹ جسے ملا ہے سو ہے وہ بھی لکچرر — پی ایچ ڈی جو ہوا ہے سو ہے وہ بھی لکچرر
پٹنہ کا جو پڑھا ہے سو ہے وہ بھی لکچرر — انگلینڈ جو گیا ہے سو ہے وہ بھی لکچرر
بیرنگ جو پھرا ہے سو ہے وہ بھی لکچرر

جوش ملیح آبادی نے اپنی نظم ''پروگرام'' میں اپنے ایک دن کی مصروفیات کو ادبی دنیا کے سامنے یوں پیش کیا ہے:

اے شخص اگر جوش کو تو ڈھونڈنا چاہے — وہ پچھلے پہر حلقۂ عرفاں میں ملے گا
اور دن کو وہ سرگشتۂ اسرار و معانی — کوئے ہنر و شہر ادیباں میں ملے گا

اس پروگرام سے متاثر ہو کر رضا نقوی واہؔی نے شاعر، لیڈر، پلیڈر، مُلّا، ایڈیٹر، پروفیسر، نقاد، بڑا صاحب کے ساتھ ساتھ خود اپنے شب و روز کا پروگرام بھی پیش کیا ہے۔ واہی صاحب نے جوش کی نظم سے مستفید ہو کر ان کی ردیف کو قائم رکھتے ہوئے ان کے ہی لب و لہجے میں سماج کے مختلف سربرآوردہ پیشہ وروں پر کامیاب پیروڈیز تصنیف کی ہیں، جو نہ صرف ان کی مقصدیت کو پیش کرنے میں کامیاب ہیں؛ بلکہ یہ فن کے تقاضوں کو بھی کما حقہ پورا کرتی ہیں۔ ایک لیڈر کا نظام اوقات دعوت قہقہہ بھی دیتا ہے اور دعوت فکر بھی:

لیڈر کو اگر آپ کبھی ڈھونڈنا چاہیں — وہ پچھلے پہر حجرۂ دلبر میں ملے گا
اور صبح کو وہ بندۂ اغراض و مقاصد — سر خم کئے دربار منسٹر میں ملے گا
اور دن کو وہ جنتا کی چراگاہ کا بھینسا — چرتا ہوا پرمٹ کسی دفتر میں ملے گا
اور شام کو احباب کے پیسوں کی بدولت — ہوٹل میں کہیں یا کسی پکچر میں ملے گا
اور رات کو ہاتھوں میں لیے بھات کی تھالی — بیوی سے جھگڑتا ہوا وہ گھر میں ملے گا

ان اشعار میں لیڈر کے لیے جن القاب و آداب اور استعارات کا سہارا لیا گیا ہے، وہ بہت برجستہ اور مبنی بر حقیقت ہیں۔ ایک لیڈر کے شب و روز کی تفصیل عبرتناک ہونے کے ساتھ ساتھ موجب طنز بھی ہوگئی ہے۔ واہؔی کی پیروڈیز میں شوخی، شگفتگی اور برجستگی بدرجہ اتم موجود ہیں۔ طنز کے نشتر سے بھی یہ خالی نہیں ہیں۔ انھوں نے ''شکم پرست ملاّ'' کے پروگرام کی کیا حسب حال تصویر کھینچی ہے۔ دیکھئے:

ملا کو اگر آپ کبھی ڈھونڈنا چاہیں — وہ پچھلے پہر نفخ کی حالت میں ملے گا

اور صبح کو وہ بندۂ مجبور مراسم　　سکڑا ہوا محراب عبادت میں ملے گا
بعد اس کے وہ ہوٹل میں خدادین میاں کے　　ناسازئ معدہ کی شکایت میں ملے گا
اور ظہر کے کچھ بعد وہ لکھتا ہوا تعویذ　　عوراتِ محلّہ کی رفاقت میں ملے گا
اور شام کو جنات کی مسجد میں کنویں پر　　تسخیر اجنّہ کی ریاضت میں ملے گا
اور محفل میلاد ہو یا بزم عروسی　　ہر رات وہ بریانی کی دعوت میں ملے گا

ان اشعار میں واہؔی کا قلم بے باکی کی حدیں چھو لیتا ہے۔ مُلّا کے شب و روز کی مصروفیات خوب؛ بلکہ خوب تر ہے، ہر شعر طنز و مزاح کی عمدہ مثال بن گیا ہے۔

اردو کے کلاسیکی ادب پر واہؔی کی نظر بہت گہری ہے۔ نظم ''غالب صدی'' دیکھیے، جس میں تین مصرعے غالب کے کس خوبصورتی سے استعمال کئے گئے ہیں:

اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے　　یعنی اردوئے معلّٰی کا مآل اچھا ہے
بات کڑوی سہی لیکن ہمیں کہنے دیجئے　　دل کے خوش رکھنے کو غالب یہ خیال اچھا ہے
جشن غالب نے جو بخشی ہے ذرا سی رونق　　وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

واہؔی کے ''پیروڈی'' اور ''تضمین'' میں ہمیں طنز و مزاح کی حسین اور متوازن آمیزش ملتی ہے۔ تضمین کے دو اشعار دیکھئے:

کاٹتی رہتی ہے کتنی گھر کی انگنائی نہ پوچھ　　کاوِ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ
حال پتلا ہو گیا ہے ہر شاعر دلگیر کا　　صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا

واہؔی کے یہاں صرف غالب اور اقبال کے اشعار پر ہی نہیں، بعض جدید شعرا کے اشعار پر بھی تضمین ملتی ہے۔

واہؔی کی نظمیں، فن کے تقاضوں کو ہر طرح پورا کرتی ہیں، ان کی نظموں میں ماحول سازی اور واقعہ طرازی کے عناصر نسبتاً نمایاں ہیں، وہ اپنی نظموں میں دلکش اور پراثر ماحول پیدا کرتے ہیں۔ واہی صاحب واقعات کے بیان میں معمولی واقعوں سے بھی کام کی ایسی ایسی باتیں اور ایسے ایسے کارآمد نکتے دریافت کر لیتے ہیں کہ قاری کو ان کی نکتہ آفرینی اور تخلیقی ہنرمندی کا قائل ہونا ہی پڑتا ہے۔ طنز و مزاح کی شاعری میں واقعہ نگاری کی ایک خاص جہت ہوتی ہے۔ یہاں بیان واقعہ بجائے خود کوئی مقصد نہیں۔ مزاح و طنز کے اسلوب میں جو مقصد اصلاح روپوش ہوتی ہے، وہاں تک پہنچنے کا یہ ایک

وسیلہ ہوتا ہے۔ مناسب واقعوں کے ذریعہ شاعر اپنے مقصدی اثرات کی شدت میں اضافہ کرتا ہے، لہٰذا واقعوں کے انتخاب اور واقعہ نگاری کے دوران خاص احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے۔ سنجیدگی حاوی ہو گئی تو تمام کئے دھرے پر پانی پھر جانے کا اندیشہ ہے۔ واہی اپنی نظموں میں اس احتیاط و اہتمام کا خاص لحاظ رکھتے ہیں۔ واقعات کی پیشکش کا انداز بے حد سادہ، مگر کافی پرکشش ہوتا ہے۔ ''آئینہ''، ''معرکہ جہیز و دین مہر''، ''ٹیڈی کفن''، ''ماہر فن''، ''جنرل اسپتال''، ''ریل کا سفر''، ''ڈکٹیٹر کا سر''، ''گھریلو منصوبہ''، ''اللہ رے مادّہ''، ''انٹرویو'' وغیرہ نظموں میں واہی کا فن پوری عشوہ گری اور تب و تاب سے جلوہ گر ہیں۔ نظم ''آئینہ'' میں ایک واقعہ کے سہارے ملا صاحب کے قول و فعل کے تضاد کو بہت خوبصورتی سے اجاگر کیا گیا ہے، ملا صاحب کہیں وعظ کر رہے تھے، اتفاقاً ان کی بیگم بھی وہاں موجود تھیں، وعظ سن کر ان کی بیوی کے دل میں بھی دینی جذبہ بیدار ہو اٹھتا ہے اور وہ اس پر عمل پیرا ہو کر اپنے گھر پہ ساٹھ مساکین کو کھانا کھلانے کا اہتمام کر ڈالتی ہیں؛ لیکن جب ملا صاحب کو حقیقت کا علم ہوتا ہے تو وہ اپنی اہلیہ کو کس طرح لعن طعن کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

بولے سر پیٹ کے ملا کہ خدا کی لعنت　　تجھ سی عورت کا تو ہے قصر جہنم میں مقام
اپنا گھر پھونک کے جنت میں بناتی ہے مکان　　کیا یہی حکم شریعت ہے ارے نافرمان
تو مرے وعظ کا کیا خاک سمجھتی مطلب　　تو ہے شیطان کی خالہ وہ خدا کا تھا پیام
فرض بندوں کا شریعت پہ عمل کرنا ہے　　ہم سے ''اللہ کے پیاروں'' کا فقط وعظ ہے کام

نظم ''معرکہ جہیز و دین مہر'' سے بھی واہی کے منفرد انداز بیان و اسلوب اور واقعہ نگاری کی صلاحیت کی غمازی ہوتی ہے۔ اپنی اولاد کو بزنس کا مال سمجھنے اور شادی کے وقت ان کی زیادہ سے زیادہ قیمت وصول کرنے والوں کے لیے یہ نظم ایک تازیانہ عبرت ہے۔ واقعہ یوں ہے کہ ایک والد محترم اپنے بیٹے کے جوان ہو جانے اور بی اے پاس کر لینے کے بعد اس کے لیے مناسب رشتے کی تلاش میں ہیں۔ رشتہ کیسا مطلوب ہے، ملاحظہ فرمائیں:

جیسے ہی نور چشم نے بی اے کیا ادھر　　بزنس کا مال ان کو سمجھنے لگے پدر
بیڑا ہوا تھا تھرڈ ڈویژن میں گرچہ پار　　شادی کا بھوت باپ کے اوپر ہوا سوار
سودا بلیک میں جو چکانے کا تھا خیال　　گاہک کی جستجو میں لگے وہ نکو خصال
بیٹے کو چک سمجھ لیا اسٹیٹ بینک کا　　سمدھی تلاش کرنے لگے ہائی رینک کا

غرض یہ کہ رشتہ طے ہو جاتا ہے اور جب بارات دلہن کے گھر پہنچتی ہے تو لڑکا شرعی مہر کی ضد کرتا ہے، جس پر لڑکی والے بالکل تیار نہیں ہوتے، نتیجتاً بات بگڑ جاتی ہے اور لڑکے والے کو بے عزت کر کے ان کا جلوس بھی نکالا جاتا ہے۔ یہ طنزیہ واقعہ دراصل تلقین کی حیثیت رکھتا ہے کہ جہیز کے لالچیوں کو یہ سمجھ میں آ جائے کہ وہ غیر شرعی حرکت کر رہے ہیں۔ نظم کے اختتام پر:

جب سے سنا ہے ہم نے یہ سنگین واقعہ   اولاد والوں کو یہی دیتے ہیں مشورہ
نور نظر کو مال تجارت بنایئے   لیکن زباں پہ نام شریعت نہ لایئے

فیشن کے نام پر ایک زمانے میں ٹیڈی ازم کا چلن عام تھا۔ انتہائی چست لباس، نیم برہنگی اور فیشن کے دوسرے طور طریقوں سے عورت، مرد کا امتیاز ختم سا ہو گیا تھا۔ لڑکوں نے لڑکیوں کی سی ہیئت اختیار کر لی تھی اور لڑکیاں مردانہ لباس میں گھومتی پھرتی نظر آتی تھیں۔ واہی کی تین نظمیں ''ٹیڈی بوائے''، ''ٹیڈی گرل'' اور ''ٹیڈی کفن'' اسی ٹیڈی ازم کے خلاف ہیں۔ نظم ''ٹیڈی کفن'' میں ایک فرضی واقعہ کا سہارا لیا گیا ہے۔ ایک فیشن پرست نوجوان ٹرک کی زد میں آ کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ اس کی تجہیز و تکفین کے لیے حسب روایت بیس گز لٹھے والا کفن منگایا جاتا ہے۔ مرنے والے کے دوست واحباب اس پر سخت اعتراض کرتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ مرنے والا جو پوری زندگی چست کپڑوں میں ملبوس رہا، بعد از مرگ بھی اس کی خواہشوں کا احترام ضروری ہے۔ چند اشعار دیکھئے:

مرنے والا جو رہا تا عمر ایک ٹیڈی بوائے   بعد مردن اس کی یوں تضحیک ہو اب ہائے ہائے
ڈیڑھ گز میں سوٹ سلواتا رہا جو عمر بھر   بیس گز کا یہ کفن ہے طنز اس کی موت پر
ہم نہیں تیار ہرگز اس تماشے کے لیے   پانچ گز کپڑا بہت کافی تھا لاشے کے لیے

واہی کی نظم ''جنرل اسپتال'' سرکاری اسپتال کی زبوں حالی اور کسمپرسی کا نقشہ کھینچتی ہے، جہاں صحت آرائی کے بجائے موت کا کاروبار ہوتا ہے۔ نظم ''اللہ رے مادّہ''، ''ماہر فن'' اور ''ڈکٹیٹر کا سر'' میں ایک نیم حکیم، اناڑی ڈاکٹر اور خبطی لیڈر کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے۔ ان نظموں میں بھی واقعہ طرازی ملتی ہے۔ ''ریل کا سفر'' میں واہی نے ہندوستانی ریل گاڑی کی بھیڑ بھاڑ سے پیدا شدہ مضحک واقعات ومناظر کے پس منظر میں نہ صرف ریلوں کے تاخیر سے آنے جانے کی خصلت پر طنز کیا ہے؛ بلکہ اسے پوری ہندی قوم کی خصلت سے تعبیر بھی کیا ہے:

معلوم نہیں آپ کو یہ نکتہ تاریخ؟   جو قوم کی خصلت ہے وہی ریل کی خصلت

اس ملک میں دونوں کو تساہل کی ہے عادت   وہ ریل کی رفتار ہو یا وقت کی رفتار
آزاد ہوا ہند تو کیا اس کی ضرورت   پابندیٔ اوقات میں ہے رنگ غلامی

معاشرتی زندگی کے مضحک پہلوؤں کا گہرائی سے مشاہدہ اور انہیں دلچسپ انداز سے برتنے نے ان کی منظومات میں نئی شان پیدا کر دی ہے، وہ ہلکے پھلکے رنگوں میں بڑا گہرا طنز کر جاتے ہیں۔

رضا نقوی واہی نے ادب کے میدان میں بھی جہاں جہاں مضحکہ خیز صورت حال کا مشاہدہ کیا، اسے اپنا ہدف بنایا ہے۔ انہوں نے شاعر، متشاعر، گویا، ناقد، محقق، تبصرہ نگار، کاتب، دانشور، خدام ادب، ترقی پسند، فیشن پرست، جدیدیے، بانیان مشاعرہ سبھی پر بھرپور طنز کیا ہے۔ اس تعلق سے ''محقق''، ''نقاد''، ''تبصرہ نگاری''، ''انٹلکچوئل''، ''گویا شاعر''، ''خدام ادب''، ''حضرت کاتب''، ''مولوی اور کامریڈ''، ''یلغار سے انتشار تک''، ''تحسین جدید''، ''جدید عملی تنقید''، ''وفاتی''، ''مشاعرہ سے پہلے اور بعد'' وغیرہ جیسی نظمیں بطور مثال پیش کی جا سکتی ہیں۔ واہی کی نظم ''محقق'' موجودہ تحقیق کے حال زار کا نقشہ پیش کرتی ہے۔ آج کس طرح کی تحقیق ہو رہی ہے اور محقق کیا کچھ کر رہے ہیں۔ واہی کے لفظوں میں دیکھئے:

سونگھتے ہیں دیر تک مرحوم کی خاک لحد   پھر یہ فرماتے ہیں اٹھ کر عالمانہ شان سے
طول وعرض قبر سے یہ صاف چلتا ہے پتہ   گورکن آئے تھے اطراف بلوچستان سے

قبر ''مرحوم'' کی سونگھ رہے ہیں اور فیصلہ گورکنوں کے بارے میں دے رہے ہیں۔ اس سے بہتر طنز تحقیق پر کیا ہو سکتا ہے؟ آج کل کے محققین کے زیر غور کون کون سے مسائل رہتے ہیں۔ واہی کی زبان سے سنئے:

زیر تحقیق آپ کے رہتے ہیں یہ سب مسئلے   کس قدر چوہے پلے تھے گھر میں مومن خان کے
پانچ بج کر پانچ پر یا پانچ بج کر سات پر   داغ نے توڑا تھا دم زانو پہ منی جان کے
رند نے اک بے وفا کے عشق میں کھائے تھے جو   وہ چھری کے زخم تھے یا گھاؤ تھے کرپان کے

نظم ''نقاد'' ایسے نقادوں پر بھرپور طنز کرتی ہے، جو اپنی دکان سجانے کے لیے غیر معیاری اور سطحی تنقیدی کاوشوں کا سہارا لیتے ہیں، ایسے نقاد چند اصطلاحات کی بدولت بزعم خود ادب کے پارکھ بننے کی کوشش کرتے ہیں، جب کہ ادب کے افہام وتفہیم کی معمولی صلاحیت بھی ان میں نہیں ہوتی؛ لیکن یہ بہت جلد ''خدائی'' کے درجے پر فائز ہو کر حکم صادر کرنے لگتے ہیں اور نظر وخبر سے بے پرواہ غیر معیاری اور سطحی مضامین کے انبار لگاتے رہتے ہیں۔ واہی ایسے نقادوں کی نکتہ چینی یوں کرتے ہیں:

ان سے ملئے آپ ہیں جو ہر شناس نقدفن / کانپتی ہے دبدبے سے آپ کے روحِ سخن
جب کہ قسمت بٹ رہی تھی عالم ارواح میں / آپ کو رکھا گیا تھا زمرۂ جراح میں
خامہ خونخوار نے اک حشر برپا کر دیا / جو بھی زد میں آ گیا اس کا صفایا کر دیا
جس سے بگڑے اس کی مٹی آپ نے کر دی پلید / ہو گئے خوش جس سے دے دی اس کو شہرت کی کلید
آپ نے زاغِ سخن کو بلبل گلشن کہا / آپ نے تک بند شاعر کو امام فن کہا

عصر حاضر کے تبصرہ نگار حضرات جو کتاب پڑھے بغیر تبصرہ کرنے کے فن میں مہارت حاصل کر چکے ہیں، واہی ان کے سلسلے میں کیا کچھ انکشاف کرتے ہیں، دیکھئے:

بلکہ اکثر ہوا ہے ایسا بھی / بو کتابوں کی دور سے سونگھی
اور جھٹ سے سنبھال کر خامہ / فکر کو فن کا دے دیا جامہ
یہ بھی مشہور ہے کہ آپ کا فن / ان کتابوں پہ بھی ہے خامہ زن
طبع ہونے کی بات دور رہی / بطن فنکار میں جو گم ہیں ابھی

یہ تبصرہ نگاری کی غلط روش پر ایک بھرپور طنز ہے۔ اس فن کے حال زار کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ آج تبصرے محض آمدنی کا ذریعہ بن گئے ہیں، لہٰذا تبصرہ کی مبادیات کو بالائے طاق رکھ کر زیادہ سے زیادہ تبصرے کے چلن نے اس اہم ترین فن کو متاثر کیا ہے۔ نظم میں ایک حد تک مبالغہ آرائی کا رنگ بھی شامل ہے؛ لیکن یہ مبالغہ آرائی بار خاطر نہیں گذرتی؛ بلکہ پر لطف ہے۔

نظم ''انٹلکچوئل'' میں واہی اردو کے ایسے ادبا وعلما کو ہدف بناتے ہیں، جو باہر کے افکار وتخیل کے غلام نظر آتے ہیں۔ شاعر مغرب کی بڑھتی ہوئی نقالی کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے یہ سوال اٹھاتا ہے کہ آخر کب تک ہمارے ادبا مستعار فکر کے اسیر رہیں گے۔ ''خدام ادب'' میں ادبی رسالوں کی بہتات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ شاعر کا خیال ہے کہ محض پیسہ کمانے اور سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے بہت سے نام نہاد ادب نواز پیدا ہو گئے ہیں، جو رسالوں کی آڑ میں صرف اپنا اُلّو سیدھا کرتے ہیں۔ واہی نے نظم ''یلغار سے انتشار تک'' میں ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کی انتہاپسندی پر بھرپور تبصرہ کیا ہے، ترقی پسند ادیب ادب برائے زندگی کے قائل تھے تو جدید ادیب ادب برائے ادب کے نظریے کے پروردہ۔ ادب برائے زندگی سماجی انقلاب کا نعرہ لایا تو جدیدیت نے ادیب کی آزادی کے نعرے بلند کئے، دونوں تحریکیں انتہاپسندی کا شکار ہو گئیں۔ مقابلہ آرائی اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے اور کمتر ثابت

کرنے کے سلسلے نے ادب کے عظیم مقصد کو فراموش کر دیا۔ واہی نے یہاں انہی دُکھتی رگوں کو چھیڑا ہے۔ ان کے مطابق ادب کبھی یلغار (ترقی پسندی) کا شکار ہو جاتا ہے اور کبھی ''انتشار'' (جدیدیت) کا۔ یلغار وانتشار کی علامتیں نہایت بامعنی وبرمحل ہیں۔ ترقی پسند تحریک کا ذکر کرتے ہوئے واہی کہتے ہیں کہ یہ تحریک ختم ہو چکی ہے اور ادب اب ایک نئی ''مصیبت'' کا شکار ہو رہا ہے:

اب غلغلہ ترقی پسندی کا ہے خموش / اب شاعری ہے اک نئے بحران کا شکار
اب محمل سخن پہ ہے قابض جدیدیت / اب دست انتشار میں ہے فکر کی مہار

اس کے بعد واہی جدیدیت کی انتہاپسندی پر وار کرتے ہیں۔ ابہام، علامت وتجرید نے ادب کو معمہ بنا دیا ہے۔ ذات، وجودیت، اشاریت، جنسیت ادب کا موضوع بن گئے ہیں۔ واہی کہتے ہیں کہ ہمارے افکار وخیالات مستعار ہیں اور ہم مغرب کی تقلید میں اپنے ادب سے بیگانہ ہو گئے ہیں، محض نقالی کرنا ہی ہمارا مقصد رہ گیا ہے:

جو حال عین کا تھا وہی غین کا بھی ہے / تب بھی تھے اور اب بھی ہیں افکار مستعار
نقالی آنکھ موند کے کرتے رہے ہیں ہم / یلغار کا وہ دور ہو یا عہد انتشار

نظم ''تحسین جدید'' اور ''جدید عملی تنقید'' میں جدید شاعری اور تنقید کی بے راہ روی پر طنزیہ وار کئے گئے ہیں۔ واہی نے نظم ''مولوی اور کامریڈ'' میں دونوں کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے دونوں کے اوصاف کو تقریباً یکساں قرار دیا ہے، جس طرح ایک مولوی مذہب کے تعلق سے انتہاپسندی کا شکار ہوتا ہے اور اسی کی وجہ سے اس کی ایک خاص ''امیج'' ابھر کر سامنے آتی ہے۔ بالکل اسی طرح ایک ترقی پسند (کامریڈ) بھی اپنے معاملات (ادب اور نظریۂ ادب) میں انتہا پسند اور انتہائی جانبدار نظر آتا ہے۔ واہی کے مطابق دونوں کے نظریات میں تضاد ہے؛ مگر دونوں کی ذہنیت تقریباً یکساں ہے۔ ان کے نزدیک ترقی پسندوں میں جو برائیاں پائی جاتی ہیں، وہی مولویوں میں بھی ہیں۔ چند اشعار دیکھئے:

تم کیوں چڑھو جو تم کو برا مولوی کہے / کافر کہے، لعین کہے، دوزخی کہے
کیوں تم کو اس کا جذبۂ دینی ہو ناگوار / تم بھی تو اے مجددِ آئین روزگار
فتوائے کفر دیتے ہو ہر شام ہر صباح / یہ بات اور ہے کہ بدل دی ہے اصطلاح
اس کی طرح تمہارے بھی منہ میں نہیں لگام / کافر کا تم نے ''بورژوا'' رکھ لیا ہے نام
تم بھی گروہ بند و جماعت پرست ہو / فرقہ پرست اور روایت پرست ہو

بگڑی اسی کی طرح تمہاری بھی ہے مشین　　اس کا بھی ایک دین، تمہارا بھی ایک دین
مسجد میں اس کو دیکھ کے کیوں غیظ تیز ہو　　تم بھی تو ''موسکو'' کی طرف سجدہ ریز ہو
دین اس کا مسخ کر دیا شیراز وطوس نے　　الّو بنا کے چھوڑ دیا تم کو روس نے

واہی نے اپنی برادری پر بھی خوب خوب چوٹیں کی ہیں، شاعر ہونے کے ناطے ان کو سب سے زیادہ تجربہ اور مشاہدہ اپنے ہم پیشہ اور ہم مشرب؛ یعنی شعرا حضرات کی رفاقت سے حاصل ہوا ہے، ویسے تو یہ سبھی جانتے ہیں کہ کچھ حضرات شاعری کے جوہر سے عاری ہونے کے باوجود خود کو شاعر جتانے کے لیے مصر رہتے ہیں، نہ تو انہیں کسی علم وفن کی شد بد ہوتی ہے، نہ اوزان و بحور کی واقفیت۔ ان کا یہ ''گویا شاعر'' آج کل ہر مشاعرے میں نظر آجاتا ہے۔ چند اشعار پیش ہیں:

ان سے ملئے آپ ہیں وہ شاعر رنگیں نوا　　جن سے بزم شعر کی مرطوب رہتی ہے ہوا
بھیرویں کی دھن میں جس دم دادرا گاتے ہیں آپ　　بن کے ساون کی گھٹا محفل پہ چھا جاتے ہیں آپ
فلم کے گانوں کی دھن پر جب سناتے ہیں کلام　　انجمن پر ٹوٹ پڑتا ہے سڑک کا اژدہام
مصرعۂ اوّل کو دو دو بار دہرانے کے بعد　　انگلیوں سے تال سر کا بھاؤ بتلانے کے بعد
لوچ پیدا کر کے قدموں میں تھرک جاتے ہیں آپ　　کچھ پھڑک جاتی ہے محفل کچھ پھڑک جاتے ہیں آپ

قطعۂ تاریخ وفات لکھنے والے وفاتی شاعروں کی جھلک بھی قابل ملاحظہ ہے:

شاعروں میں چند ایسے بھی ہیں اصحاب کمال　　قطعۂ تاریخ لکھنے میں نہیں جن کی مثال
کون کب مرتا ہے رہتے ہیں اس کی تاک میں　　چھائی رہتی ہے سدا کافور کی بو ناک میں
سورۂ یٰسین پڑھنے کے عوض با شد و مد　　جوڑنے لگتے ہیں بس تاریخ رحلت کے عدد
گھر میں ایک کہرام ہے سب لوگ ہیں غم سے نڈھال　　پر خوشی ہے آپ کو تاریخ نکلی بے مثال

شعرا حضرات سے متعلق واہی نے کثیر کامیاب نظمیں لکھی ہیں، جن میں ''چاند اور شاعر''، ''بے چارہ شاعر''، ''شاعر مئے خوار''، ''شاعر بسیار گو''، ''مشاعرہ سے پہلے اور بعد''، ''اسم اعظم''، ''بانیان مشاعرہ سے''، ''جشن شاعر''، ''کارپوریشن میں مشاعرہ'' وغیرہ اہم ہیں۔ رضا نقوی واہی صرف دوسروں پر ہی نہیں ہنستے؛ بلکہ خود پر ہنسنے کے فن سے بھی بہ خوبی واقف ہیں۔ انہوں نے ''شعرستان سیریز'' کی دس مزاحیہ نظمیں تخلیق کر کے ایک نئی روایت کی بنیاد ڈالی ہے۔ ان نظموں میں تحریک شعرستان شعرا کی ایک خیالی اسٹیٹ کا قیام سے لے کر وہاں پیش آنے والے غیر معمولی اور مضحک حالات کی عکاسی ملتی

ہیں۔ شعرا کی عادات واطوار، نیز ان کی خامیوں وکوتاہیوں کو مزاحیہ رنگ دیا گیا ہے۔ شعرا کے لیے علاحدہ اسٹیٹ کے تصور میں ہی مزاحیہ رنگ پنہاں ہے۔ یہ موضوع ہی اتنا مضحک ہے کہ بے اختیار ہنسی کو تحرک ملتا ہے اور اسی مضحک پہلو سے واہی نے فیض اٹھایا ہے۔ واہی کو آپ کہیں سے اٹھا کر پڑھئے، آپ کے چہرے پر تبسم کا آجانا یقینی ہے۔ ساتھ میں یہ بھی لگتا ہے کہ کلام میں وہی پختگی ہے، جو ایک شاعر میں ہونی چاہیے۔ واہی طنز پر کم اور مزاح پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ ان کے یہاں خالص مزاح نگاری کی وافر مثالیں موجود ہیں۔ ''عورتوں کا سال''، ''راشن کی دوکان''، ''انٹرویو''، ''مشاعرہ سے پہلے اور بعد''، ''خدمت ادب''، ''لے دہی''، ''غالب صدی اور اردو''، ''چرچل کی مناجات''، ''اسم اعظم''، ''اے بھائی مصدق''، ''دل بدلی''، ''انتقال کے بعد''، ''الیکشن کی کرامات''، ''اے میری زیر پائی''، ''رکابیہ''، ''میر فتنہ''، ''چمچے''، ''شہرت کے لیے''، ''مکھن''، ''اقتباساتی ادیب''، ''مکتوبی ادیب''، ''رسائل میں چھپنے کی ترکیب''، ''رسائل مفت حاصل کرنے کی ترکیب''، ''جاگیرداری''، ''شکوہ اللہ سے''، ''الیکشن اور برقعے'' وغیرہ ایسی نظمیں ہیں، جو خالص مزاح نگاری کی عمدہ مثالیں ہیں۔ واہی کے یہ مزاحیہ شاہکار اردو ادب میں اضافے کی حیثیت رکھتے ہیں، کوئی موضوع بذات خود مزاحیہ نہیں ہوتا، یہ مزاح نگار کا فنی کمال ہوتا ہے کہ وہ اپنے اظہار میں مزاح کا پہلو نکال لیتا ہے۔ اس کے پاس مزاح پیدا کرنے کے متعدد طریقے ہوتے ہیں؛ لیکن یہ طریقے کسی جامد اصول کے پابند نہیں ہوتے: اس کے لیے فنکار کبھی جملوں کی ساخت اور الفاظ کی ترتیب میں الٹ پھیر سے کام لیتا ہے، کبھی ایمائیت اور ابہام سے کام لیتا ہے، کبھی مختلف زبانوں کو باہم خلط ملط کرتا ہے اور کبھی مکالمے میں وہ انداز اختیار کرتا ہے، جو عام رواج سے الگ ہو، علاوہ ازیں مزاح پیدا کرنے کے لیے مزاح نگار کے کچھ اپنے مخصوص انداز بھی ہوتے ہیں۔ واہی نے اپنی شاعری میں مزاح پیدا کرنے کے لیے ان آزمائے ہوئے طریقوں کے علاوہ کچھ نئے طریقے بھی وضع کئے ہیں۔

شاعری میں مکالماتی پیرایہ بیان کے ذریعہ مزاح پیدا کرنے کا کام بھی واہی سے قبل ہو چکا ہے۔ واہی نے بہ طریق احسن اس روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ مثال کے طور پر نظم ''انٹرویو'' کے چند اشعار پیش ہیں:

''آپ کی تعلیم''، ''بی اے پاس ہوں عالی جناب''　　''کمبی نیشن؟''، ''ہسٹری، اردو ادب، علم الحساب''
''ہسٹری؟''، ''اچھا تو یہ کہئے اشوکا کون تھا؟''　　''پاٹلی پترا کے شاہنشاہ، اکبر کا چچا''
''مرزا غالب کے بارے میں بھی ہیں کچھ جانتے؟''　　''کیوں نہیں؟''، ''ہم شاعر اعظم ہیں ان کو مانتے''
''ذوق کے شاگرد ہیں، ہم عصر میر وشاد ہیں''　　''شاہ نامے کے مصنف ہیں، جگت استاد ہیں''

"ذہین" امیدوار کے مضحک جوابات ہی اس نظم میں مزاح نگاری کا سبب بنتے ہیں۔ واہیؔ کسی بات کو مزاحیہ انداز میں بیان تو کرتے ہیں؛ لیکن ان کی نظر بہت سنجیدہ ہوتی ہے؛ یعنی وہ زندگی کو دیکھتے سنجیدہ نظر سے ہیں؛ لیکن بیان کرنے کا انداز مزاحیہ ہوتا ہے؛ اسی لیے جب وہ طنز کرتے ہیں تو اس میں بھی ایک چبھن پنہاں ہوتی ہے:

"شکریہ! حاضر جوابی آپ کی ہے بے نظیر
آپ آگے چل کے بن سکتے ہیں اک اچھے وزیر"

آخری شعر میں اس نظم کو ایک نیا موڑ یوں دیا گیا ہے کہ ایسا جاہل اور نااہل شخص ایک کامیاب وزیر یقیناً بن سکتا ہے۔ نظم بڑی دلچسپ، پرمزاح اور طنز آمیز ہے۔ واہیؔ نے اپنی نظم "لے دہی" میں اردو اکادمیوں کے جزوی مالی تعاون کی وساطت سے اردو میں جو خار و خس کے ڈھیر لگتے جا رہے ہیں، اسے اپنا ہدف بنایا ہے۔ ہندوستان کی مختلف اکادمیاں اپنے حواریوں کو فائدہ بہم پہنچانے میں مصروف ہیں۔ نتیجتاً غیر معیاری کتابوں کا انبار لگتا جا رہا ہے، جنہیں کوئی پوچھتا تک نہیں۔ "لے دہی" کی طرح بیچنے پر بھی نہیں:

جیسے دہی فروش لیے سر پہ ٹوکرا　　بازار میں پکارتا پھرتا ہے لے دہی
اب یوں ہی اپنے دوش پہ لادے ہوئے کتاب　　پھرتے ہیں صبح و شام سخنور گلی گلی
واہی بھی باوجود ضعیفی ہے ان کے ساتھ　　گٹھری ہے اس کے کاندھوں پہ بھی "واہیات" کی

"عورتوں کا سال" ایک دلچسپ مزاحیہ نظم ہے۔ عورتوں نے آزادی کے نام پر مردوں کے اختیارات چھین لیے ہیں، جس سے سماج کی کایا ہی پلٹ کر رہ گئی ہے۔ مردوں کے کام عورتیں انجام دے رہی ہیں اور ظاہر ہے کہ مرد عورتوں کا کام کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ شاعر کا خیال ہے کہ عورتوں کا سال مردوں کے لیے مصیبت ثابت ہوا۔ یہاں موازنہ سے مزاح پیدا کیا گیا ہے؛ مگر اس میں طنز کی بھی صورت موجود ہے:

عورتوں کا سال کیا آیا قیامت آ گئی　　اک وبائی شکل میں مردوں کی شامت آ گئی
مرد سارے دوسرے درجہ کے شہری بن گئے　　یعنی جتنے بھی مگرمچھ تھے گلہری بن گئے
کھودی دھوتی، پینٹ اور بش شرٹ نے اپنی اساس　　ساڑیاں اور بیل باٹم بن گئے قومی لباس
چھاؤنی جا کے بسائی عورتوں کی فوج نے　　لفٹ رائٹ کی جگہ لے لی "اوئی" اور "نوج" نے

خوبصورت و برجستہ تشبیہات اور روزمرہ کے الفاظ و محاورے کے استعمال نے اس نظم کو زبان

و بیان کی سطح پر بھی اہم بنا دیا ہے۔ نظم "راشن کی دوکان" راشن کے لیے لگی لمبی قطار میں جاری گفتگو اور موقع بہ موقع مضحک واقعات و صورت حال کا احاطہ کرتی ہے۔ واہیؔ گندم کی دوکان کو کوچہ دلبر سے تشبیہ دے کر ابتدا ہی میں مزاح کی طرف رجوع ہو جاتے ہیں۔ ان کے مطابق راشن کی دوکان میدان حشر ہے، جہاں عشق و عاشقی کے معاملات کے ساتھ ساتھ دوستوں اور دشمنوں کے بننے اور بگڑنے کی داستان رقم کی جاتی ہے، بھیڑ کا بے لگام ہو جانا اور فساد کے ڈر جیسے موضوعات انتہائی مزاحیہ پیرایہ بیان میں ادا ہوئے ہیں۔ مشتے نمونہ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں:

پالا جو پڑا اس سے تو یہ مان گئے ہم　　گندم کی دوکاں کوچۂ دلبر سے نہیں کم
منظر ہے وہی حشر کا میدان وہی ہے　　دربان سے پٹ جانے کا سامان وہی ہے
رونق بھی وہی بھیڑ بھی وحشت بھی وہی ہے　　چشمک بھی ہے آپس میں رقابت بھی وہی ہے

واہیؔ کی نظم "اے میری زیرپائی" کا موضوع چپل ہے۔ دراصل یہ شاعر کی ایک وفادار چپل کا مرثیہ ہے، جسے انہوں نے مزاحیہ انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ اپنی چپل سے اسی طرح محبت کرتے ہیں، جس طرح کوئی اپنے عزیز ترین رشتے دار یا محبوب سے کرتا ہے۔ انہیں اپنی زیرپائی کے بچھڑ جانے کا غم ہے۔ وہ نہایت درد انگیزی کے ساتھ کہ جو مزاح کا موجب ہوتی ہے، اس کا مرثیہ رقم کرتے ہیں۔ چپل سے گہری محبت اور ہمدردی ہی وجہ مزاح ہے۔ نظم کافی طویل ہے، یہاں کچھ بند پیش کیے جاتے ہیں:

اے سن رسیدہ چپل اے میری زیرپائی　　اے میرے پائے خستہ کی ہمدم رجائی
شاید اب آ گیا ہے تیرا دمِ جدائی......اے میری زیرپائی
جاتی تھی ساتھ میرے بازار، ہاٹ، دفتر　　تیرے نصیب میں بھی لکھا ہوا تھا چکر
چلنا تھا کام تیرا کیچڑ ہو یا کہ کائی......اے میری زیرپائی
چکر نے رات دن کے تیری کمر کو توڑا　　گھس گھس کے رفتہ رفتہ ٹانکوں نے ساتھ چھوڑا
ہر جوڑ بند کھل کر دینے لگے دہائی......اے میری زیرپائی

نظم "مشاعرہ سے پہلے اور بعد" دونوں مواقع کا خاکہ اڑاتی ہے۔ مشاعرے سے پہلے شعرا کی ظاہری آؤ بھگت اور مشاعرے کے بعد منتظمین کے رفوچکر ہو جانے اور شعرا حضرات کی کسمپرسی کا مزاحیہ منظر بہت دلچسپ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ واہیؔ زمین ہی نہیں آسمانوں پر بھی توجہ دیتے ہیں؛ اس لیے کہ انسان نے آسمان پر بھی کمند ڈال دی ہے، جس کے نتیجے میں آج سائنس و ٹکنالوجی کا دور دورہ

ہے۔ آج کے دور میں واہیؔ جب ہمارے معاشرے کی روایتی سوچ کو محسوس کرتے ہیں تو انہیں سخت مایوسی ہوتی ہے، وہ افسوس کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ انسان کا قدم خلا میں چاند تک پہنچ چکا ہے؛ لیکن ایک ہم ہیں کہ آج بھی روایتی فکر میں جکڑے ہوئے لکیر کے فقیر بنے بیٹھے ہیں اور اپنے مقدر کو کوستے ہیں۔ واہیؔ کا خیال ہے کہ روایتی فکر کی اسیری بھی ہماری ناکامی کا سبب بن سکتی ہے۔ انہوں نے اپنی نظم ''اکیسویں صدی کی ولادت قریب'' میں سوسائٹی کی روایتی سوچ کو ہدف بناتے ہوئے اسی جانب اشارہ کیا ہے۔ اس نظم کے دو بند دیکھئے:

انساں کے پاؤں روند چکے چاند کی زمین — ٹکنا لوجی پہنچ گئی مریخ کے قریں
ہم رویت ہلال پہ بھی متفق نہیں

وہ اور ہیں کہ جن کے عزائم ہیں معتبر — امکاں کو جو بناتے ہیں جولانگہ بشر
ہم تو ہیں صرف اپنے مقدر کے نوحہ گر

سائنس وٹکنالوجی نے ہمیں ٹی۔وی اور کمپیوٹر کی شکل میں اہم تحفہ دیا ہے، جس سے ہماری ترقی ضرور ہوئی ہے؛ لیکن اس سے بعض نقصانات بھی ہو رہے ہیں۔ واہیؔ نے اسی بنیاد پر اپنی نظم ''ٹی وی فوبیا'' تخلیق کی ہے، اس میں انہوں نے ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین صاحب کے جاپان دورے کا ذکر کرتے ہوئے اس وقت کے ہندوستان کا خوفناک نقشہ کھینچا ہے، جس زمانے میں ہمارا ملک تقسیم کے بعد فرقہ پرستی، انتہا پسندی اور نکسل واد کی چپیٹ میں تھا۔ واہیؔ ان حالات سے شدید طور پر متاثر ہوئے، یہی وجہ ہے کہ ان کی نگاہ میں یہاں کے قانون اور انتظامیہ مشکوک بنے رہے۔ ''ٹی وی فوبیا'' میں انہوں نے ان شائقین کی بھی خبر لی ہے، جو ٹی وی اسکرین پر زیادہ چپک کر اپنا قیمتی وقت برباد کرتے رہتے ہیں اور جنون کے عالم میں سارے ضروری کاموں کو التوا میں ڈال دیتے ہیں۔ چند اشعار دیکھئے:

مجتبیٰ صاحب سے جب پوچھا گیا جاپان میں — کون سی بیماریاں مہلک ہیں ہندوستان میں
بولے نکسل واد، فرقہ واریت، آتنک واد — ہو رہا ہے ریزہ ریزہ جن سے قومی اتحاد
چھوت کی اک اور بیماری ہے مثل کالرا — جس کو عرف عام میں کہتے ہیں ٹی وی فوبیا
یہ مرض چھایا ہوا ہے قوم کے اعصاب پر — ایک اک گھر ہے محمد شاہ رنگیلے کا گھر
آج کل اس دائرے کی زد میں ہے پورا سماج — کر دیا ہے اس نے ٹھپ معمول کا ہر کام کاج
عشق نے جس طرح سے غالب نکما کر دیا — ہے اثر انداز سب پر یوں ہی ٹی وی فوبیا

واہیؔ کے فن میں جذبی ردعمل نمایاں ہے؛ لیکن ان کے یہاں جذبات کا فنکارانہ اظہار پایا جاتا ہے۔ ان نظموں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ واہیؔ کا مطالعہ تو وسیع ہے ہی، ساتھ میں ان کا مشاہدہ بھی بہت عمیق ہے۔ یہاں ان کی ذہانت اور بذلہ سنجی کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کا حسن بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ واہیؔ کے ''منظوم خطوط'' بھی ان کی شعری فن پر مضبوط گرفت کا پتہ دیتے ہیں۔

واہیؔ کی شاعری میں ہجو کا انداز حاوی ہے، ان کی اکثر نظموں پر شہر آشوب کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ وہ بالعموم واقعہ نگاری اور قصہ طرازی سے کام لیتے ہیں۔ چند نظموں میں تمثیل کے پیرائے کو بھی اپناتے ہیں۔ کہیں کرداروں کی زبانی ان کے بگڑے ہوئے اطوار پر روشنی ڈالی ہے۔ واہیؔ کو زبان اور فن پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ تشبیہ اور کنائے سے خوب کام لیتے ہیں، تراکیب سازی میں بھی انہیں کمال حاصل تھا۔ واہیؔ نے اپنے کلام میں زور اور وزن پیدا کرنے کے لیے انگریزی اور ہندی لفظوں کو بھی کثرت سے استعمال کیا ہے۔

واہیؔ کے کلام سے معیاری اور دلچسپ طنز و مزاح کے جتنے نمونے پیش کئے جا سکتے ہیں، اتنے ان کے دیگر ہم عصروں کے کلام سے پیش کرنا مشکل ہیں۔ کسی فنکار کی کامیابی کا ایک پیمانہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کے کلام کا کتنا حصہ پر اثر ہے۔ رضا نقوی واہیؔ کے بارے میں یہ بات بلاخوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ ان کے کلام کا پچھتّر فیصد حصہ دلچسپی کے جملہ عناصر سے آراستہ ہے، جس کی وجہ سے اردو کی ظریفانہ شاعری میں ان کا نام محفوظ رہے گا۔ ان کے کلام میں مشاہدہ اور موضوعات کا جو تنوع ملتا ہے، وہ کہیں اور نظر نہیں آتا۔ واہیؔ طنز و مزاح کے ایسے منفرد شاعر ہیں، جنہوں نے Episodes سے خاصا کام لیا ہے۔ اردو میں اس کا چلن بہت کم رہا ہے۔ ابتدا میں یہ صورت تھی کہ کسی مزاحیہ، یا طنزیہ نکتے کو واضح کرنے کے لیے ایک پورا قصہ مرتب کیا جاتا تھا۔ یہ پورا قصہ دراصل اس پوائنٹ، اس نکتے کو فوکس کرتا تھا، جو بنیادی ہوتا تھا۔ واہیؔ نے اکثر قصہ جاتی طنزیہ ومزاحیہ اشعار کہے ہیں۔ ان کا Wit اور Humour ایک خاص انداز کا ہوتا ہے، جو کسی اور سے میل نہیں کھاتا۔ انہوں نے اپنی فطری ذہانت اور طبعی ظرافت سے اردو شاعری کو طنز و مزاح کا جو اعلیٰ سرمایہ عطا کیا ہے، اس کا ذکر ہمیشہ فخر کے ساتھ کیا جائے گا اور جب بھی اردو کے چند بڑے اور اہم ظرافت نگار شعرا کی کوئی فہرست تیار ہوگی تو اس میں واہی صاحب کا نام بہر صورت شامل ہوگا؛ کیوں کہ یہ نہ صرف حسن اظہار کے معاملہ میں؛ بلکہ حسن فکر و فن کے معاملے میں بھی عظیم اور غیر فانی شاعر ہیں۔

واہیؔ کا اسلوب نگارش

ادب اور فن زندگی اور اس کے تجربات کا ہی فنکارانہ اظہار ہے۔صنفِ شاعری بھی اس حقیقت سے مستثنیٰ نہیں،شاعری میں غزلوں اور نظموں میں اس کی اہمیت ہمیشہ نمایاں رہی ہے؛ بلکہ غزل کے مقابلے میں نظموں میں اس کی اہمیت اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے؛ کیوں کہ نظم زندگی کے کسی واقعے ،یا تجربے کا ہی علامتی اور فنکارانہ اظہار ہوتی ہے۔ادب میں طنزیہ اور ظریفانہ اسلوب کے لیے بھی واقعہ نگاری کلیدی حیثیت کی حامل ہوتی ہے،جس میں طنز ومزاح نگار شاعر،یا ادیب انسانی زندگی ،سماج،یا واقعات وحادثات کے کسی ناہموار پہلو کو ہی اپنے طنز ومزاح کا موضوع بناتا ہے؛ کیوں کہ طنز وظرافت نگار کا مقصد قاری کو ذہنی حظ بخشنا،یا مسرت کا احساس دینا ہی نہیں؛ بلکہ انسانی کردار اور معاشرے میں موجود ناہمواریوں کا احساس دلانا بھی اس کی ترجیح ہوتی ہے اور رضا نقوی واہیؔ تو اس معاملے میں نہایت حساس واقع ہوئے ہیں۔واہیؔ طنز ومزاح کو محض مسرت اور بصیرت کا وسیلہ نہیں سمجھتے؛ بلکہ وہ اسے اصلاح معاشرے کے لیے ایک کارآمد ذریعہ بھی مانتے ہیں۔

واہیؔ کا شمار عصرِ حاضر کے باکمال شاعروں میں ہوتا ہے،انھوں نے انسانی زندگی اور اس کے اطراف میں پیش آنے والے واقعات وحادثات کا انتہائی سنجیدگی اور گہرائی سے مطالعہ کیا ہے؛ تاہم وہ واقعات کی نوعیت کا اندازہ محض سطح پر نظر آنے والی ہلچل کو دیکھ کر نہیں لگاتے؛ بلکہ اس کی تہہ تک پہنچنے کی سعی کرتے ہیں اور پھر اسے طنز ومزاح کی چاشنی میں لپیٹ کر نہایت شگفتہ الفاظ میں اس

طرح پیش کرتے ہیں کہ سننے والا ایک نئی کیفیت سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا،اس کیفیت میں مسرت کا احساس بھی ہوتا ہے اور تلوار کی کاٹ بھی محسوس ہوتی ہے۔

واہیؔ کے اسلوب کا ایک خاص پیرایہ واقعہ نگاری اور قصہ طرازی ہے۔وہ کسی موضوع پر براہ راست اظہار خیال کرنے کے بجائے کوئی واقعہ،یا قصہ گڑھتے ہیں،جس سے موضوع کا مزاحیہ پہلو اجاگر ہو جاتا ہے،نیز اس میں طنز کے نشتر بھی چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔''ماہر فن''،''ریل کا سفر''، ''بلیڈ''،''راشن کی دوکان''،''گھریلو منصوبہ''،''ڈکیٹیٹر کا سر''،''معرکۂ جہیز ودین مہر''،''رحمانیہ ہوٹل''، ''جدید عملی تنقید''،''چمر چٹ''،''نور چشم''،''نئی یونیورسٹی'' وغیرہ جیسی نظمیں اسی طرز پر لکھی گئی ہیں۔ ''ریل کا سفر'' ایک دلچسپ اور معنی خیز نظم ہے،اس کا انداز ہجو اور شہر آشوب کا ہے۔واہیؔ نے اس میں ہندوستانی ریل کے سفر کی جیتی جاگتی تصویر کشی کی ہے:

درپیش اچانک جو ہوئی ایک ضرورت   واہی سے ہوئی ریل پہ چڑھنے کی حماقت

آدھمکی ذرا وقت سے پہلے ہی وہ گاڑی   واہی نے گھڑی دیکھی تو لاحق ہوئی حیرت

القصہ ٹکٹ منزل مقصود کا لے کر   اسباب لیے دوڑ کے پہنچا وہ بہ عجلت

آگے سے بھی پیچھے سے بھی کھاتا ہوا دھکے   داخل ہوا اک چھوٹے سے ڈبے میں بہ دقت

ڈبا تھا کہ اک گنج شہیداں کا نمونہ   تھوڑی سی جگہ تنگ تر از گوشۂ تربت

اسباب پہ بیٹھا تھا کوئی ٹانگ اڑائے   کھڑکی پہ کھڑا تھا کوئی دیوار کی صورت

اس ماحول میں واہیؔ کا دم گھٹنے لگا،ان کی حالت دیکھ کر مقابل میں بیٹھے ایک بزرگ کو ترس آیا اور انہوں نے واہیؔ کو مخاطب کر کے فرمایا:

فرمانے لگے آپ کہاں جاؤ گے بھیا   برداشت بھی کر پاؤ گے رستے کی صعوبت

یہ ریل نہیں حضرت سودا کی ہے گھوڑی   دو روز میں کرتی ہے اک دن کی مسافت

کل اس کو پہنچنا تھا جہاں، آج ہے پہنچی   چوبیس پہر لیٹ ہے اللہ ری سرعت

یہ سن کر واہی چونکے اور کہا:

میں نے تو سمجھا تھا کہ ہے وقت پر آئی   چوبیس پہر لیٹ؟ قیامت ہے قیامت

بولے وہ بزرگ آپ بڑے سادہ ہیں بھیا   ہم لوگ کسی کام میں کرتے نہیں عجلت

وہ ریل کی رفتار ہو یا وقت کی رفتار — اس ملک میں دونوں کو تساہل کی ہے عادت
پابندیٔ اوقات میں ہے رنگ غلامی — آزاد ہوا ہند تو کیا اس کی ضرورت

واہی مزاح برائے مزاح کے قائل نہیں، وہ ایک باشعور فنکار ہیں، وہ اپنی نظموں کی بنیاد تصور پرستی پر قائم موضوعات کے بجائے اپنے تجربات کے آئینے میں نظر آنے والی تلخ سچائیوں پر رکھنا پسند کرتے ہیں۔ ان کی شاعری میں واقعہ طرازی کا یہ پہلو، ان کے رچے ہوئے سماجی شعور کا آئینہ دار ہے۔ ان کے مزاج کا یہ پہلو عصری زندگی سے ان کے گہرے اور مربوط رشتے کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ انسانی زندگی اور معاشرتی حالات کے ناہموار گوشوں کو جس ذہانت اور ہمدردانہ پیرائے میں پیش کرتے ہیں وہ قاری کی بصیرت میں اضافہ بھی کرتا ہے اور مسرت کا احساس بھی دلاتا ہے۔ ان کے مجموعۂ کلام میں شامل نظموں میں سے چند پر ہی ایک نظر ڈالیں تو ان کی مشاہداتی باریک بینی، طنز آمیز بصیرت، ظریفانہ ذہانت، جزرسی و نکتہ آفرینی اور قوتِ بیان کے مظاہرے کا قائل ہو جانا پڑتا ہے۔ ان کے مجموعوں میں شامل نظموں کے عنوانات بھی ان کے موضوعات و واقعات تک رسائی میں معاون نظر آتے ہیں۔ ان کی نظموں کے عنوانات مثلاً ''لے دہی''، ''عورتوں کا سال''، ''انٹرویو''، ''ماسٹر پلان''، ''غالب صدی اور اردو''، ''انٹلکچوئل''، ''جنرل اسپتال''، ''لیڈری کا نسخہ''، ''لال فیتہ''، ''ماہرِ فن''، ''ریل کا سفر''، ''وفاتی''، ''ایک اشتہار''، ''نئے لیڈر کی دعا'' اور ''ٹکٹ'' وغیرہ سے واضح ہو جاتا ہے کہ شاعر کیا کہنا چاہتا ہے۔ یہ نظمیں ان سماجی ناہمواریوں کا ذکر کرتی ہیں، جن سے ہمارا معاشرہ آزادی کے ستر سال کے بعد بھی آج تک متاثر ہے۔ ہندوستان کی مختلف ریاستوں میں اردو اکادمیوں کا قیام ملک میں اردو زبان و ادب کے فروغ کی غرض سے حکومت کے ذریعہ قائم کی گئی ہیں؛ لیکن ان کے قیام کے ساتھ جس طرح ملک میں غیر معیاری تصنیف و اشاعت کی ایک باڑھ سی آئی ہے، وہ شعر و ادب کے گرتے ہوئے معیار کا پتہ دیتی ہے۔ ''اہلِ کتاب'' کہلانے کی دھن میں ''لے دہی'' کے مصداق ہر کس و ناکس، معیاری و غیر معیاری، استاد و نو آموز سطحی تجربے پر قائم، یا تُک بندی کرنے والے مصنفین کی ایک بھیڑ سی اُمڈ آئی ہے۔ نظم ''عورتوں کا سال'' میں شاعر نے اس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ۱۹۷۶ء کو اقوامِ متحدہ کے ذریعہ ''خواتین کا سال'' قرار دیئے جانے کے بعد سے عورتوں میں حقوقِ نسواں کے متعلق جو جوش و خروش دیکھا جا رہا ہے، اس کے بعض منفی پہلو بھی سامنے آئے ہیں۔ نظم ''انٹرویو'' ہمارے ناقص تعلیمی نظام پر ایک طنز ہے، جو ملک میں نااہل تعلیم یافتہ

اور بے روزگار نوجوانوں کی ایک فوج تیار کرنے میں مصروف ہے۔ ''ماسٹر پلان'' ملک کی ترقی کے حوالے سے حکومت کے دعووں کی قلعی کھولتی ہے اور عوام کی خستہ حالی کی کامیاب تصویر کشی کرتی ہے۔ ذیل کے چند اشعار دیکھیں:

میں ہر طرح سے خرم و آسودہ حال تھا — جس وقت ابتدا ہوئی پہلے پلان کی
جاپانی طرزِ کاشت کا ہوتا گیا فروغ — قیمت بھی ساتھ ساتھ بڑھی جو کی دھان کی
جب دوسرا پلان چلا زور و شور سے — ہر شئے فروخت ہو گئی، اپنے مکان کی
اور تیسرے پلان کے عرصے میں رات دن — مٹی میں ساکھ ملتی رہی خاندان کی
چوتھا پلان جلد ہی ہونے کو ہے شروع — اب کے نہ تن کی خیر ہے اپنے، نہ جان کی
سندری کے کارخانے میں ختم پلان تک — تیار ہو گی کھاد مرے استخوان کی

اوپر کے اشعار محض ایک واقعہ کا انتخاب اور حقیقت کا فنکارانہ اظہار ہی نہیں، واہی کی وسیع النظری کی بھی داد طلب کرتے ہیں۔ یہ اشعار حکومت کے کھوکھلے دعووں کی قلعی ہی نہیں کھولتے؛ بلکہ آزادی کے بعد آج تک ہماری حکومتوں کی وفاداری کس طبقے کے ساتھ وابستہ رہی ہے، اس کا بھی واضح اظہار ہیں۔ اسی طرح نظم ''غالب صدی اور اردو'' ملک میں اردو کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا وہ کرب بن کر ابھرتی ہے، جو غالب صدی کے مصنوعی ہنگاموں میں دب کر رہ جاتی ہے۔ دراصل واہی مشاہدے کے بجائے تجربے پر زیادہ بھروسہ کرتے ہیں، جس کے سبب معمولی سے معمولی واقعہ بھی ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہو پاتا، خواہ واقعہ کسی نااہل ڈاکٹر کی جھوٹی مہارت کا ہو، ہماری ٹرینوں کی خستہ حالی اور ریلوے کی بدنظمی کا، تاریخ وفات لکھنے والے شاعروں کی اس خود غرضی کا جو تاریخ وفات لکھنے کی غرض سے دوسروں کی موت کے منتظر ہوتے ہیں، یا پھر انتخابی نظام کے پیچھے چھپے ہوئے خفیہ مفادات کی مکروہ اور خود غرض سیاست کا۔ واہی شعر و ادب کی توانا روایت کے حامی ہیں۔ اس لیے شعر و ادب میں پیدا ہونے والے منفی رجحانات کی اصلیت کو بھی بے نقاب کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ 'جدیدیت' کی بے مقصدیت پر وہ کس طرح یلغار کرتے ہیں ذیل کے اشعار سے نمایاں ہے:

بارود و خون و تیشہ و مزدور کے عوض — موضوع شاعری کے ہیں اب تھوک اور کھکھار
ہے جست و خیز، دائرہ جنسیات میں — کچھ منچلے بنے ہیں ''فرائڈ'' کے پیشکار
شرمائے ''کام دیو'' کو بھی عریانیت نے یوں — بڑھ کر کیا ہے رنگ فحاشی کا اختیار

دراصل واہیؔ کے موضوعاتِ شعری ان کے متعلقہ عہد اور معاشرے سے وابستگی کو ہی ظاہر کرتے ہیں۔ واہیؔ سماجی طور پر ایک فعال شخص تھے، ان کے روابط سماج کے ہر شعبے کے افراد سے رہے، سیاسی حلقے کے افراد سے لے کر متوسط طبقے کے مختلف پیشوں سے وابستہ ان کے ملنے والوں کا ایک وسیع حلقہ تھا، جس کے سبب ہی ان کے تجربات کو وسعت ملی، ان تجربات کے حوالے سے انھیں زندگی اور معاشرے کی ناہمواریوں کا جو احساس پیدا ہوا، وہ خوشگوار بھی تھا اور تلخ بھی؛ لیکن ان کے مزاج میں انسان دوستی اور دردمندی کا عنصر بھی شامل تھا، ان کے مزاج کی یہ فطری دردمندی اور انسان دوستی کا جذبہ ان کی شاعری میں طنز وظرافت کا اسلوب بن کر سامنے آتا ہے اور ان کے انداز بیان کو خوشگوار بنا دیتا ہے۔ واہی کے اسلوب کی یہی شگفتگی ان کی واقعیت نگاری کو منفرد بنا دیتی ہے۔

واہی طنز نگاری کے لیے تمثیل سے بھی کام لیتے ہیں۔ تمثیلی نظموں میں بھی قصہ گوئی، یا واقعہ نگاری کا انداز ملتا ہے۔ ''کر پریشاں''، ''لیلائے کرپشن''، ''جاگیرداری''، ''شعرستان میں کبوتر بازی'' اور ''مولوی اور کامریڈ'' عمدہ تمثیلی نظمیں ہیں۔ نظم ''لیلائے کرپشن'' میں واہی نے کرپشن کو ایک شوخ حسینہ کے روپ میں پیش کیا ہے۔ انہوں نے پہلے اس کے حسن اور اداؤں کی اس طرح تصویر کھینچی ہے:

آئی ہے مرے شہر میں اک شوخ حسینہ   سرشار جوانی ہے کہ ساون کا مہینہ
رعنائی کے تیور ہیں کہ طوفاں کا قرینہ

اک محشر جذبات ہے ظالم کی جوانی   مستانہ ادائیں ہیں کہ دریا کی روانی
ہر منہ میں بھر آتا ہے جسے دیکھ کے پانی

یہ ہر ایک کو اپنی اداؤں کے جال میں پھانستی ہے، خواہ وہ دفتر کا کلرک ہو، یا افسر، یہاں تک کہ ہمارے قومی لیڈران بھی اس کی زلفوں کے اسیر ہو چکے ہیں:

جو دیش کے سیوک تھے اہنسا کے پجاری   خود ان سے حسینہ نے کہا میں ہوں تمہاری
اور ان پہ بھی الفت کا جنوں ہو گیا طاری

اب دیش کی سیوا کی بھلا کیا ہے ضرورت   اب وقت کہاں ہے جو کریں قوم کی خدمت
اب وہ ہیں اور اس شوخ کی آغوش محبت

اس بات پر روشنی ڈالی جا چکی ہے کہ طنز ومزاح کی شاعری ایک مشکل فن شاعری ہے، جو مختلف جہات پر مشتمل ہوتی ہے۔ واقعہ نگاری کی طرح اس کی ایک جہت خاکہ نگاری بھی ہے، جو شخصیت اور

سماج کے متضاد رشتوں کے باہم تفاعل کے دوران ردِعمل کے طور پر منعکس ہونے والی فکر وعمل کی تصویر ہوتی ہے۔ طنز ومزاح نگار شاعر اس ردعمل پر گہری نگاہ رکھتا ہے اور اسے اپنے شعور کی روشنی میں فنی ہنرمندی کے ساتھ پیش کرنے کی سعی کرتا ہے؛ تاہم خاکہ نگاری ایک مشکل فن ہے اور طنز ومزاح کے حوالے سے تو یہ مشکل ترین فن کہا جا سکتا ہے۔ خاکہ نگاری نہ صرف شخصیت اور اس کے حوالے سے واقعات وحالات کی سچی تصویرکشی پر مبنی ہوتی ہے؛ بلکہ شخصیت کی نفسیاتی پیچیدگیوں اور اس کے اعمال کا جائزہ لیتے ہوئے خاکہ نگار سے ہمدردی اور مشفقانہ روّیے پر اصرار بھی کرتی ہے؛ تاہم طنز ومزاح نگاری میں صاحبِ خاکہ، یا واقعاتِ متعلقہ کی معروضیت اور خاکہ نگار کی موضوعیت جس تضاد وہم آہنگی پر قائم ہوتی ہے، وہ طنز ومزاح کی منظوم شاعری کو مشکل فن بنا دیتی ہے۔ واہیؔ کو بھی اس مشکل کا احساس رہا ہے؛ لیکن وہ اس وادیٔ پرخار سے اس لیے کامران گزر جاتے ہیں کہ ان کا روئے سخن کسی ذاتِ خاص کے بجائے معاشرے اور افراد کے ان عمومی اوصاف کی طرف ہوتا ہے، جو اخلاقی زوال اور سماجی ناہمواریوں کی تصویر پیش کرتے ہیں اور جسے وہ فرد اور معاشرے کے فروغ کی راہ میں مہلک تصور کرتے ہیں۔ واہیؔ خود کو محض شاعر نہیں، ایک مصلح، ایک مفکر اور ایک مصور بھی سمجھتے ہیں۔ وہ معاشرے اور فرد کے درمیان ایسے خوشگوار رشتے کی تمنا رکھتے ہیں، جس میں زندگی کی جمالیات رقص کناں ہو کر کائنات میں نیا رنگ بھر سکے۔ واہیؔ کی یہ دنیا اب تک وجود میں آسکی ہے، یا نہیں؟ اس سے قطع نظر ایسی دنیا کے تصور میں ان کا موئے قلم عصری نظامِ زندگی کی تصویرکشی میں ہمیشہ سرگرم رہا ہے۔

واہیؔ کی طنزیہ وظریفانہ شاعری معاشرے اور افراد کے عمل وردعمل کے اعتبار سے ایک ایسا آئینہ خانہ ہے، جس میں معاشرے اور افراد کے تمام نقوش روشن ہو کر ہر داغ کو نمایاں کر دیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ واہیؔ خیال پرستی پر اپنی شاعری کی بنیاد نہیں رکھتے، ان کے سامنے ہمارا معاشرہ اور اس کے افراد اپنے معاملات ومسائل کے ساتھ ہمیشہ موجود ہوتے ہیں؛ اس لیے وہ فرد اور سماج کو ہی اپنا موضوعِ سخن بناتے ہیں، اس کوشش میں وہ فرد اور سماج کے چہرے سے نقاب ہٹانا ضروری سمجھتے ہیں، اس کی خوبیوں کی جہاں تعریف کرتے ہیں، وہیں اس کی کمزوریوں پر گرفت بھی کرتے ہیں۔ واہیؔ ایک مشاق خاکہ نگار کی طرح اپنے کمال فن کا مظاہرہ اس طرح کرتے ہیں کہ ہمارا پورا معاشرہ اپنے تمام تر حسن وقبح کے ساتھ روشن ہو اٹھتا ہے۔ انھوں نے جن شخصیات کے خاکے اڑائے ہیں، وہ سب ہمارے آس پاس کی دنیا سے آتے ہیں۔ ان میں شاعر بھی ہیں اور ادیب

بھی، مبصر بھی ہیں اور مدیر بھی، محقق بھی ہیں اور ناقد بھی، طالب علموں کی مضحکہ خیز حرکتیں ہوں، یا اساتذہ کا نامناسب روّیہ، یا یہ خاکہ کسی مولوی کا ہو، یا کامریڈ کا واہیؔ کے قلم سے نکلا ہوا ہر لفظ قاری کی بصیرت میں ایک اضافہ بن جاتا ہے۔

واہیؔ کے منظوم خاکے پر نظر ڈالنے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے، انھوں نے خاکہ نگاری کی اس روایت کو آگے بڑھانے کے لیے متقدمین کے علاوہ اپنے معاصرین کو بھی نظر انداز نہیں کیا ہے۔ یقیناً اس مطالعے کے دوران جمیل مظہریؔ، شمس گیاویؔ اور غبار بھٹیؔ کے منظوم خاکوں کے نمونے بھی ان کی نظروں سے ضرور گذرے ہوں گے؛ تاہم واہیؔ کا انداز ان سب میں مختلف ہے۔ واہیؔ کے یہاں حالیؔ کا سا جوسوز و گداز اور دردمندی ملتی ہے، وہ ان کے ہم عصروں میں مفقود ہے۔ اس کی توثیق کرتے ہوئے منظر اعجاز اپنے ایک مضمون ''رضا نقوی واہیؔ کی منظوم خاکہ نگاری'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''جناب رضا نقوی واہیؔ کا انداز قطعی مختلف ہے، جو متقدمین و معاصرین سے اکتسابِ فیض کے نتیجے میں مرتب ہوا ہے؛ لیکن ان کی بعض نظموں میں حالیؔ کا سا سوز وگداز اوران ہی کی سی دردمندی پائی جاتی ہے۔ اس سلسلے میں واہیؔ کی نظم ''اسم اعظم'' کو سرفہرست رکھا جاسکتا ہے''۔

عصری معاشرہ اپنی خوبیوں سے کم اور خامیوں سے زیادہ پہچانا جاتا ہے۔ معاشرے کے اخلاقی زوال کا عکس انسانی کردار کے فکر و عمل سے مترشح ہوتا ہے۔ واہیؔ ایک تیز نظر رکھنے والے شاعر ہیں۔ ان کی نگاہوں سے انسانی سیرت کا کوئی عیب پوشیدہ رہ جائے یہ ناممکن ہے۔ کلامِ واہیؔ میں کئی نظمیں ایسی ہیں جن میں انسانی سیرت کے ان عیوب کو طنز و مزاح کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ نظم ''محقق'' بھی واہیؔ کی ایک ایسی ہی نظم ہے جس میں آج کے ایک محقق کی سیرت و کردار کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ نظم میں نہ صرف معاصر محققین کی سہل پسندی پر حرف گیری کی گئی ہے، بلکہ زندہ ادبی شخصیتوں کو نظر انداز کر کے محض مردہ شخصیات کو ہی موضوع سخن بنانے کی ان کی روش کو ہدف تنقید بنایا گیا ہے۔ دراصل واہیؔ نے اس نظم میں ادب میں مردہ پرستی کی جو قدیم روایت آج تک جاری ہے اس پر گہرا طنز کیا ہے۔ ذیل میں چند اشعار پیش ہیں:

سرحدِ وہم وگماں کو چھوڑ کر میلوں پرے   کھیلتا ہے ذہن دور از عقل امکانات سے

اس پہ یہ طرہ کہ رکھتے ہیں کھلے بندوں جناب   دل میں بغض للّٰہی اوروں کی تصنیفات سے
گر کسی نے لکھ دیا یہ میر کے دو ہاتھ تھے   آپ اس کو رد کریں گے اپنی تحقیقات سے
آپ کی تحقیق یہ ہوگی کہ لولہا تھا غریب   اور اسے ثابت کریں گے اس کی کلیات سے

دوسرا بند دیکھیں:

کوئی کتنا ہی بڑا ہو فلسفی، شاعر، ادیب   عمر بھر اس سے رہا کرتے ہیں آپ انجان سے
ہاں مگر جیسے ہی پا جاتا ہے بیچارہ وفات   آپ اس کو چاہنے لگتے ہیں جی سے، جان سے
سونگھتے ہیں دیر تک مرحوم کی خاکِ لحد   پھر یہ فرماتے ہیں اٹھ کر عالمانہ شان سے
طول و عرض قبر سے یہ صاف چلتا ہے پتہ   گورکن آئے تھے اطرافِ بلوچستان سے

اپنی ایک نظم ''گویّا شاعر'' میں مشاعروں میں گانے والے شاعروں کے ایکشن اور انداز ترنم اور نظم ''نقاد'' میں عصرِ حاضر میں بعض نقادوں کے روّیے کو طنز و مزاح کا نشانہ بناتے ہوئے واہیؔ جس خوبصورت انداز میں اپنے خیالات و جذبات کا اظہار کرتے ہیں، وہ ان کی خاکہ نگاری کی عمدہ مثال کہی جائے گی۔ واہیؔ کے اسلوب میں خاکہ نگاری اکثر واقعہ نگاری کے سائے میں پروان چڑھتی ہے، اس میں طنز و ظرافت کا ان کا مخصوص رنگ ایک نئی کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ نمونے کے طور پر ذیل میں چند بند حاضرِ خدمت ہیں۔ ''گویّا شاعر'' کا ایک بند دیکھیں:

آپ سے واہیؔ کا ہے یہ دست بستہ مشورہ   آپ کو فطرت نے بخشا ہے مغنی کا گلا
آپ کی شفقت کا ہے محتاج رقاصی کا فن   کیوں نہ بزمِ رقص میں تبدیل ہو بزم سخن
کس قدر بے چین ہیں یہ پاؤں گھنگھرو کے لیے   گردشیں محدود کیوں ہوں چشم و ابرو کے لیے
لطف آجائے جو سازندے بھی ہوں کچھ ساتھ ساتھ   اس طرف پیروں میں جنبش اس طرف طبلے پہ ہاتھ
پھیل جائے چار جانب پھر تو شہرہ آپ کا   اور ہر تقریب شادی میں ہو مجرا آپ کا

نظم ''نقاد'' میں واہیؔ نقاد کا تعارف کراتے ہوئے کہتے ہیں:

ان سے ملئے آپ ہیں جو ہر شناسِ نقدِ فن   کانپتی ہے دبدبے سے آپ کے روئے سخن
جب کہ قسمت بٹ رہی تھی عالم ارواح میں   آپ کو رکھا گیا تھا زمرۂ جرّاح میں

دنیا میں آنے کے بعد حضرت نقاد کو عالم نوجوانی میں شعر گوئی کا شوق پیدا ہوا؛ لیکن موزوں طبیعت کہاں سے لاتے؟ چنانچہ شعر گوئی ترک کی اور افسانے کی طرف راغب ہوئے، کسی طرح

کہانی تیار کی اور ایک ہفتہ وار کو شائع کرنے کے لیے بھیج دیا۔ مدیر سے دوستانہ تعلقات تھے؛ اس لیے اشاعت کی امید تھی؛ تاہم مدیر نے اسے کسی قابل نہ سمجھا اور اشاعت سے انکار کر دیا۔ اس صورتِ حال نے دل میں انتقامی کیفیت پیدا کر دی۔ جذبات میں اشتعال پیدا ہوا اور تھوڑی سی مشق سے نکتہ چینی کا سلیقہ آ گیا۔ پھر کیا تھا؟ جس پہ قلم اٹھایا، اس کی شامت آ گئی:

خامۂ خونخوار نے اک حشر بر پا کر دیا / جو بھی زد میں آ گیا اس کا صفایا کر دیا
جس سے بگڑے اس کی مٹی آپ نے کر دی پلید / ہو گئے خوش جس سے دے دی اس کو شہرت کی کلید
مشغلہ دن رات کا ہے ان پہ نشتر، ان پہ طنز / مرزا غالبؔ کے منھ آئے، پھر کیا مومنؔ پہ طنز
آئے جب علمِ بیاں کی معنوی تفصیل میں / صنعت ایہام کی دم باندھ دی تعلیل میں
استعارے کو دھڑلے سے کنایہ لکھ گئے / جوش میں تنقید کے ظلمت کو سایہ لکھ گئے
الغرض جو جی میں آیا لکھ کے شائع کر دیا / وقت اپنے ساتھ اوروں کا بھی ضائع کر دیا

اوپر درج کیے گئے چند اشعار محض حوالے کے طور پر پیش کیے گئے ہیں، ورنہ کلامِ واہیؔ میں شاعر، نقاد، محقق، کاتب، فلسفی، طلبا، پروفیسر، سیاست داں اور معاشرے کے بہت سارے دوسرے افراد کے منظوم خاکے موجود ہیں، جو ان کی فکر و بصیرت کی داد دیتی ہے۔ واہیؔ نے اپنی ذات کے حوالے سے اپنا خود نوشت منظوم خاکہ بھی لکھا ہے۔ ''انتقال کے بعد'' کے عنوان سے ان کا یہ منظوم خاکہ اٹھائیس اشعار پر مشتمل ہے، اس خاکے کے حوالے سے انھوں نے شاعر، وفاتی شاعر؛ یعنی قطعہ تاریخ وفات لکھنے والے شاعر، ناقد، محقق اور پبلشر وغیرہ کی کارگزاریوں کو ہدفِ طنز بنایا ہے۔ اس نظم کا مطالعہ کرتے ہوئے کسی کی موت پر اظہارِ تعزیت کے لیے آئے ہوئے لوگوں کی تمام نقل و حرکت کی تصویر آنکھوں میں روشن ہو جاتی ہے کہ کس طرح لوگ زندگی میں جن کی ذات میں سینکڑوں کیڑے نکالنے کی کوشش میں مصروف رہتے ہیں، مرنے کے بعد انھیں فرشتہ بنا دیتے ہیں۔ واہیؔ کی نظم ''انتقال کے بعد'' سے ذیل کے اشعار اس کی خوبصورت مثال ہیں:

آخرش دنیا سے واہیؔ کا ہوا جب انتقال / اس کے گھر والوں پہ کیا گذری نہ پوچھو اس کا حال
ایک شاعر اشک باری جن کی گوہر بار تھی / لاش ابھی اٹھی نہ تھی، نظم ان کی اک تیار تھی
قطعہ تاریخ اک شاعر نے بر جستہ کہا / نام سے مرحوم کے نکلا تھا پورا مادہ

عام طور پر لوگوں کے مرنے کے بعد تعزیتی خطوط، مضامین اور جلسوں کا تانتا لگ جاتا ہے۔ ماہناموں کے خصوصی نمبر شائع ہونے شروع ہو جاتے ہیں، لہٰذا شاعر ظریف کے بھی مرنے کے بعد ہر محفل میں ایک ہی رائے اور ایک ہی خیال رقص کرنے لگا تھا کہ ''تھا یہ رونا ہو گیا سورج ظرافت کا غروب''؛ بلکہ:

ایک ناقد نے یہاں تک بڑھ کے لکھا جوش میں / ان کا فن اکبرؔ سے بالاتر تھا تن میں توش میں
اک محقق گھر پہ اس کے رات دن جانے لگے / اس کے اجڑے گھر کی تصویریں اتروانے لگے
اس کی تحریروں کا متن و حاشیہ دیکھا کیے / اس کی نظموں کا ردیف و قافیہ دیکھا کیے
کاوشِ تحقیق سے ان کی برا تھا سب کا حال / کرتے پھرتے تھے محلے میں یہ اک اک سے سوال
کون سا روغن کیا کرتا تھا استعمال وہ / بھات کھاتا تھا کہ دونوں وقت روٹی دال وہ

اور بیچارے مرحوم شاعر کی روح حیرت زدہ رہ جاتی ہے:

روح واہیؔ دیکھتی تھی دور سے یہ انقلاب / اس کی حیرت بن رہی تھی اک سوال بے جواب
اہلِ فن کو موت سے ہرگز نہ ڈرنا چاہیے / بلکہ ممکن ہو تو کوشش کر کے مرنا چاہیے

اوپر کے اشعار سے واضح ہے کہ واہیؔ کو طنز و ظرافت کے اعلیٰ معیار کا بخوبی علم تھا۔ وہ سخت سے سخت حقائق کو جس شاعرانہ حسن کے ساتھ پیش کرنے میں کامیاب ہیں، طنز و ظرافت کی منظوم معاصر شاعری میں اس کی نظیر مشکل سے ہی مل سکتی ہے۔ طنز کے گہرے وار کے ٹیس دیتے ہوئے احساس کو وہ ظرافت کے ذریعہ جس طرح لطیف احساس میں بدل دیتے ہیں، وہ واہیؔ ہی کا حصہ ہے۔

واہیؔ نے اپنی بعض نظموں میں کرداروں کی زبانی ان کے خصائل بیان کئے ہیں۔ وہ اپنے کرتوتوں پر پشیماں نہیں ہوتے؛ بلکہ بڑی ڈھٹائی سے انہیں فخریہ بیان کرتے ہیں۔ ''میں اسٹوڈنٹ ہوں''، ''ٹیوشن''، ''ہم کون ہیں، ہم کیا ہیں''، ''کارپوریشن میں مشاعرہ'' اسی قبیل کی نظمیں ہیں۔ نظم ''میں اسٹوڈنٹ ہوں'' میں واہیؔ موجودہ دور کے طالب علموں کی حالت زار پر تنقید کرنے کے بجائے خود طالب علم کی زبانی ہی اس کا اعمال نامہ یوں پیش کرواتے ہیں:

میں اسٹوڈنٹ ہوں اے ہم نشیں، اس دورِ حاضر کا / تمدن کے گھڑے میں ہوں نئی تہذیب کا سرکا
مجھے سوراج نے بخشا ہے آزادی کا پروانہ / اگر پابند ہوں کچھ تو فقط قید عناصر کا
میں لکچر روم میں بکواس سننے کا نہیں عادی / کلیجہ منھ کو آتا ہے مؤرخ کا مبصر کا

مجھے قانون کی حد بندیوں سے سخت نفرت ہے   رہوں پابند اگر اب بھی تو آزادی پہ لعنت ہے
وہ سرکاری بسیں ہوں یا سواری ریل گاڑی کی   ٹکٹ مانگے کوئی مجھ سے بھلا یہ کس کی شامت ہے
میں دے کر امتحاں ہر فکر سے آزاد رہتا ہوں   سپرد ابا میاں کے پیروی کرنے کی خدمت ہے

واہی کی شاعری میں ہجو نگاری کا انداز حاوی ہے، وہ بالعموم اپنے ہدف کو براہ راست استہزا کا شکار بناتے ہیں، بطور مثال ان کی نظم ''نقاد چی'' کے یہ اشعار ملاحظہ فرمائیں:

عالم تنقید کی وہ اک نئی مخلوق ہے   آدمی کا ہے کو ہے، ٹوٹی ہوئی بندوق ہے
گر کسی ہم عصر کا ادب میں نام ہے   اس کا ڈسنا نیش عقرب بن کے اس کا کام ہے
اس کا ذوق عیب پرور، اس کا ذہن ہرزہ کار   باغ میں چنتا ہے جا کر خارہائے نوک دار
الغرض مت پوچھئے اس کے تصور کی امنگ   جب بھی آئے گی طبیعت میں حماقت کی ترنگ
تو جہالت کا کمال خاص دکھلائے گا وہ   سنگ رہ کو عرش کے تاروں سے ٹکرائے گا وہ

واہی کے یہاں نظموں کی مضحک نقل یعنی تحریف (پیروڈی) کے بھی عمدہ نمونے ملتے ہیں۔ ان کی اس نوع کی نظمیں لفظی اور معنوی خوبیوں سے آراستہ ہیں، ان کے پیروڈی کلام میں طنز کی لطافت دیکھی جا سکتی ہیں، انہوں نے نظیر اکبرآبادی کی نظم ''آدمی نامہ'' کی بڑی عمدہ تحریف کی، جس کا عنوان ''پروفیسر نامہ'' ہے۔ واہی اس نظم کے پس پردہ ایک اہم اور باوقار پیشہ ور کو طنز کا نشانہ بنا کر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دور حاضر میں بدعنوانی کے سبب اعلیٰ تعلیمی شعبے کا معیار اس قدر گر چکا ہے کہ جس شخص کے بارے میں پروفیسر بننے کا کوئی گمان بھی نہیں کر سکتا، آج وہ بھی اس شعبے کی کرسی پر براجمان دیکھا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں بعض افراد ایسے بھی نظر آتے ہیں، جن کی ناقص صلاحیت اور کارکردگی انہیں ہر قدم پر شرمندگی کا احساس دلاتی ہے۔ گویا واہی اپنی تحریف کے پس پردہ متعلقہ شعبے سے جڑے ہوئے پورے نظام پر سوالیہ نشان لگا دیتے ہیں، ان کی مشہور پیروڈی نظم ''پروفیسر نامہ'' کے دو بند پر غور فرمایئے، یہ کس قدر مضحکہ خیز ہے:

ڈی لٹ جسے ملا ہے سو ہے وہ بھی لکچرر   پی ایچ ڈی جو ہوا ہے سو ہے وہ بھی لکچرر
پٹنہ کا جو پڑھا ہے سو ہے وہ بھی لکچرر   انگلینڈ جو گیا ہے سو ہے وہ بھی لکچرر
بیرنگ جو پھرا ہے سو ہے وہ بھی لکچرر

بے معنی شعر کو جو سمجھتا ہے معنی دار   اور معنی دار شعر ہیں جس کی سمجھ پہ بار
جو شاعری کو سمجھے سیاست کا قرض دار   کنجشک فن کو صید سمجھ کر عقاب وار
چنگل سے نوچتا ہے سو ہے وہ بھی لکچرر

واہی نے علامہ اقبال کی مشہور و معروف نظم ''دعا'' کی پیروڈی بہت ہی مشاقی اور صناعی سے کی ہے۔ اقبال ہی کی بحر، قافیہ اور ردیف میں لکھی گئی نظم ''نئے لیڈر کی دعا'' بہت ہی عمدہ پیروڈی ہے۔ اقبال کی نظم کو سامنے رکھ کر ''نئے لیڈر کی دعا'' پڑھیے تو اس کا لطف دوبالا ہو جائے گا۔

بھگوان مرے دل کو وہ زندہ تمنا دے   جو حرص کو بھڑکا دے اور جیب کو گرما دے
وادیٔ سیاست کے اس ذرے کو چمکا دے   اس خادم ادنیٰ کو اک کرسیٔ اعلیٰ دے
اوروں کا جو حصہ ہے مجھ کو وہی داتا دے   محروم بتاشہ ہوں تو پوری و حلوہ دے
ہاں مرغ مسلم دے، ہاں گرم پراٹھا دے   سوکھی ہوئی آنتوں کو فوراً ہی جو چکنا دے
تحریر میں چستی دے، تقریر میں گرمی دے   جنتا کو جو پھسلا لے اور قوم کو بہکا دے
کرسیٔ وزارت پر اک جست میں چڑھ جاؤں   تدبیر کو پھرتی دے تقدیر کو جھٹکا دے
مفلس کی لنگوٹی تک باتوں میں اتروا لوں   احسان کے پردے میں چوری کا سلیقہ دے
قاتل کی طبیعت کو بسمل کی ادا سکھلا   خونریزی کے جذبے کو ہمدردی کا پردا دے
تھوڑی سی جو غیرت ہے وہ بھی نہ رہے باقی   احساسِ حمیت کو اس دل سے نکلوا دے
القصہ مرے مالک تجھ سے یہ گزارش ہے   مرغی وہ عنایت ہو سونے کا جو انڈا دے

واہی نے جوش ملیح آبادی کی نظم ''پروگرام'' کی بھی تحریف کی ہے، انہوں نے اپنے پروگرام کے سلسلہ ہائے منظومات میں مربوط طریقے سے بہت ہی عمدہ تحریف نگاری کی ہے۔ انہوں نے بڑا صاحب، شاعر، ملا، ایڈیٹر، پلیڈر، لیڈر، پروفیسر، نقاد اور فلسفی جیسے اہم سماجی کرداروں کے مشاغل کا دلچسپ نقشہ پیش کیا ہے۔ واہی نے اپنے پروگرام سریز کی نظموں میں ان صاحبان علم و ادب کی روزانہ کی مشغولیات پر سے پردہ اٹھایا ہے۔ وہ ان کی بے وقوفی اور قابل اعتراض عمل کو طنز و تمسخر کا نشانہ اس طور سے بناتے ہیں کہ یہ اہم ہستیاں بھی شک و شبہات کے حصار میں آ جاتی ہیں۔ واہی نے پروگرام سریز کی تحریفوں میں جس طرح مختلف سربرآوردہ پیشہ وروں پر طنز کے نشتر چبھوئے ہیں، اس سے اس فن میں ان کی اختراعی صلاحیت کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہ ان میں قافیہ پیمائی سے مزاح پیدا

کرتے ہیں اور ان کا انداز اظہار بہت سلیس اور رواں ہے۔دیکھئے واہی صاحب شاعروں کے پورے دن کی روٹین پر کتنی گہری نظر رکھتے ہیں:

شاعر کو اگر آپ کبھی ڈھونڈنا چاہیں
وہ پچھلے پہر فکر کی دلدل میں ملے گا

اور صبح کو آئینہ لیے سامنے اپنے
اشعار تغزل کے ریہرسل میں ملے گا

دن کو وہ جگر گوشۂ بیکاری و افلاس
بستر پہ خیالات کے جنگل میں ملے گا

اور شام کو حلقے میں مریدانِ سخن کے
بیٹھا ہوا رحمانیہ ہوٹل میں ملے گا

اور شب کو سر بزم سخن صدر کے نزدیک
گالوں کو پھلائے صف اوّل میں ملے گا

اب ذرا اردو اخبار کے ایڈیٹر صاحب کا خاکہ بھی ملاحظہ فرمائیے:

اور آپ ایڈیٹر کو اگر ڈھونڈنا چاہیں
وہ پچھلے پہر خانہ عزلت میں ملے گا

اور صبح کو وہ شہر کا مشہور صحافی
اخبار فروشوں کی جماعت میں ملے گا

اور دن کو وہ بیڑی کا دھواں منھ سے اڑاتا
مصروف مضامیں کی ادارت میں ملے گا

اور شام کو کاتب جو رہے گا کبھی غائب
بے چارہ جٹا شغل کتابت میں ملے گا

اور رات کو پتھر پہ جو جم جائے گی کاپی
تادیر پریس مین کی خدمت میں ملے گا

واہی نے تضمین نگاری میں بھی کمال دکھایا ہے، انہوں نے کئی نامور شعرا کے مشہور مصرعوں پر گرہ لگا کر معنی آفرینی پیدا کی ہے۔بطور مثال چند تضمین پیش ہیں:

کاٹتی رہتی ہے کتنی گھر کی انگنائی نہ پوچھ
''کاو کاو سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ''

حال پتلا ہو گیا ہے ہر شاعر دلگیر کا
''صبح کرنا شام کا لانا ہے جوئے شیر کا''

ہر طرف سے اٹھ رہا ہے شور دار و گیر کا
''کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا''

یونہی اٹھائی گئی بحث جب زباں کے لیے
''سخن بہانہ ہوا مرگ ناگہاں کے لیے''

سنکھیا سے بھی علاج غم ہستی نہ ہوا
''ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا''

رضا نقوی واہیؔ کو زبان پر بڑی قدرت حاصل ہے، انہوں نے زبان کو تخلیقی سطح پر برتا ہے، اس کا اندازہ ان کی اختراع کردہ تشبیہات، کنایوں اور تراکیب سے ہوتا ہے۔تشبیہ نگاری کی چند مثالیں دیکھئے:

جامعہ سے دوسرے ہی روز ڈگری مل گئی
کیکٹس کی شاخ میں گویا کلی سی کھل گئی

(''تحقیقی مقالہ برائے فروخت'')

زباں تھی کہ پراچین کال کا جادو
عدوئے فہم، رقیب خرد، جنوں تمثال

کرختگی تلفظ ارے معاذ اللہ
کہ جیسے ڈھول پر پڑنے لگی ہو زور سے تال

کوئی چٹان لڑھکتی ہوئی گرے جیسے
کسی پہاڑی ندی کی ہو جیسے باڑھ میں چال

(''زبان'')

نادر تشبیہات کو بروئے کار لانے کے علاوہ ان کے اسلوب کی ایک اور خوبی کنایوں کے استعمال میں بھی مضمر ہے۔کنایوں کے ساتھ واہی کبھی استعاروں کو بھی جوڑ دیتے ہیں۔بطور مثال چند اشعار ملاحظہ ہوں:

جو بجٹ رکھا گیا تھا خوں چڑھانے کے لیے
یعنی اردو کو بچانے اور چلانے کے لیے

بینک بیلنس اس رقم سے دن بہ دن بڑھتا گیا
شیر نے کھا کر جو چھوڑا گیدڑوں میں بٹ گیا

کر چکا ہے اپنا مجموعہ مرتب آج وہ
ختم جس نے کل کیا اردو کا پہلا قاعدہ

اک ٹرک کی شوخیِ رفتار کا مارا ہوا
شہر کا اک نوجواں اللہ کو پیارا ہوا

کووں کی سخن پر وہ تقاریظ لکھے گا
اور مضحکہ نغمۂ بلبل میں ملے گا

غیر شاعر کا یہاں پر داخلہ ممنوع ہے
مملکت خالی ہے یکسر نارمل انسان سے

واہی اپنی ظریفانہ شاعری میں اردو کے ساتھ انگریزی الفاظ اس طرح پیوست کرتے ہیں کہ کلام میں ایک نیا لطف پیدا ہو جاتا ہے۔یہ طریقہ نیا نہیں ہے اور ان سے پہلے متعدد شعرا نے اپنے کلام میں انگریزی الفاظ کا استعمال کیا ہے۔خاص طور پر اکبرالہ آبادی نے یہ تکنیک جس کثرت کے ساتھ اور جتنے بلیغ انداز میں استعمال کی ہے، ہم اس سے بخوبی واقف ہیں۔دلاور فگار نے تو انگریزی کے الفاظ ہی نہیں بلکہ پورے فقرے اور کہیں کہیں مکمل جملے استعمال کئے ہیں۔اس ضمن میں واہی کی کاوشیں بھی خوب ہیں۔مثلاً:

بیٹے کو چک سمجھ لیا اسٹیٹ بینک کا
سدھی تلاش کرنے لگے ہائی رینک کا

ہلوں کی جگہ ہیں قلم اور پنسل
گرومور فوڈ ہے، گرو مور فائل

لفٹ رائٹ کرتے پھر سب واک آؤٹ کر گئے
خانۂ غم سے نکل کر جانب پکچر گئے

امیدوار تھا واہی بھی ممبری کے لیے
کہ شارٹ کٹ ہے یہی اک توانگری کے لیے

واہی اُنمل، بے جوڑ الفاظ، تراکیب اور قافیوں سے بھی مزاح پیدا کرتے ہیں:

ٹیچر آپس میں چلائیں خوب جی بھر کر لتاڑ　　کوئی اس کی ٹانگ کھینچے، کوئی دے اس کو پچھاڑ

(''ویلفیئر اسٹیٹ'')

واہی، تضاد سے بھی مزاح پیدا کرنے کا ہنر رکھتے ہیں:

جتنے بلیکئے تھے بگلا بھگت بنے ہیں　　ملتے ہیں ووٹروں سے جا جا کے فدویانہ

(''الکشن'')

ان کے فن میں مضحک انداز بیان کی مثالیں بھی موجود ہیں۔ بطور مثال چند اشعار دیکھئے:

ڈالڈائی طرز کی مضموں نگاری کیجئے　　اور پھر شہرت کے ٹٹو پر سواری کیجئے

(''اقتباساتی ادیب'')

میک اپ کی پٹاری میں تفریح کا ساماں ہو　　تھالی کا کبھی بیگن، بیگن کی کبھی تھالی

(''فلم اسٹار'')

واہی کے یہاں عمدہ تصویر کشی اور محاکات نگاری کی وافر مثالیں ملتی ہیں۔ وہ شاعری کے داخلی اور خارجی عناصر سے اپنی ظرافت کو تیز تر بنا دیتے ہیں، مثلاً نظم ''الکشن'' کا یہ شعر دیکھئے:

نیلام ہو رہی ہے جنتا کی پھر لنگوٹی　　دن رات کھل رہا ہے چندوں کا کارخانہ

واہی قافیہ کے حسن، ندرت اور انوکھے پن سے بھی لطف پیدا کرتے ہیں۔ غیر متوقع قافیے کیف کو دوبالا کر دیتے ہیں۔ وہ مشہور شعرا کے اشعار اور مصرعوں کی تضمین کر کے انہیں تیر بہ ہدف بنا دیتے ہیں:

بھر کے اک آہ کہا دل نے کہ مر جائیں گے　　مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

یوں ہی اٹھائی گئی بحث جب زباں کے لیے　　سخن بہانہ ہوا مرگ ناگہاں کے لیے

واہی کے طنز و مزاح میں تہہ داری اور معنی آفرینی پائی جاتی ہے۔ وہ اپنی نظموں میں فن کو پوری وضعداری کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ واہی اپنی نظموں کو پراثر عروج تک پہنچا کر عموماً نظم کے اختتام پر ظرافت کی تیز نوک چبھاتے ہیں:

پڑھ لکھ کے ڈاکٹر نہ پلیڈر بنے گا وہ　　ہو کر جوان، قوم کا لیڈر بنے گا وہ

(''نور چشم'')

عوام دشمنی پیشہ رہا ہے مدت سے　　تمام عمر لڑا ہوں حق و صداقت سے

(''اپیل'')

تشبیہات و استعارات، رمز و ایما، الفاظ کی نشست و برخواست، مصرعوں کی تراش و خراش، تعمیر و تنظیم، پراثر اور تراشیدہ تراکیب اور تلمیحات و محاورات کے استعمال میں بھی رضا نقوی واہی کی فنکاری اپنا جوہر دکھاتی ہے۔ نئی نئی لفظی ترکیبوں اور عام بول چال کے الفاظ کے ذریعہ بھی طنز و مزاح کی ایک مسرت آمیز کیفیت پیدا کرنے میں انہیں مہارت حاصل ہے؛ مگر ایک خاص تہذیبی سطح سے وہ نیچے کبھی نہیں اترتے اور نہ دیگر شعرا کی طرح پھکڑپن و ابتذال کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ واہی کبھی محض لفظی گورکھ دھندے کے قائل نہیں رہے۔ وہ اپنے فن کی بنیاد زندگی کے حساس مسائل اور عہد حاضر کی صداقتوں پر رکھتے ہیں؛ اسی لیے ان کے یہاں تازگی، توانائی اور زندگی کا گہرا شعور ملتا ہے، ساتھ ہی زبان و بیان کی لطافت و پختگی بھی۔ چند مثالیں دیکھئے:

ہر ایک دل میں ہے آگ آپ کی لگائی ہوئی　　غرض زباں نہ ہوئی اک دیا سلائی ہوئی

(''میر فتنہ'')

مضامیں کی کھادیں بڑی کارگر ہیں　　کلرکوں کی میزیں کل بارور ہیں

(''گرومور فوڈ'')

آج ہم پر بھی مگر جبر نظارہ ہے وہی　　وہی نیرنگ تماشہ وہی نیرنگ نظر

وہ چراگاہ سیاست ہو کہ میدان ادب　　طوق زرّیں ہے وہی اور وہی گردن خر

(''طوق زرّیں'')

لب پر ہو رام رام، بغل میں چھری رہے　　چہرہ کلین شیوڈ، مگر دل میں ہو غبار

رضا نقوی واہی کی زباں سازی کا ہنر ان کی وضع کردہ تراکیب میں بھی جھلکتا ہے۔ انہوں نے نوع بہ نوع تراکیب اختراع کی ہیں، مثلاً طوائف صفتی، ورزش ابرو، کنجشک فن، کوہ متانت، تخم ہوش، طائر مفہوم، مشق صد چہرگی، اسپ قدامت، گندم زدگاں، دریچۂ قسمت، خیابان سیاست، شعر افگن، حسرتوں کی ناؤ، بھوک کی زنبیل، امید کا دریچہ، باتوں کا چانڈو خانہ، تخیل کی تفسیر، فکر کی بنسری، خیالات کے جنگل وغیرہ وغیرہ۔ ان کے ذریعے طنز و مزاح کے گل بوٹے کھلانے کے ساتھ رعایت لفظی سے بھی خوب کام لیتے ہیں۔ ان کے یہاں زبان میں شستگی اور روانی پائی جاتی ہے۔ سادگی اور پرکاری ان کے کلام کا وصف خاص ہے۔

کتابیات

(الف) **کتب**

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف/مرتب	ناشر	سنہ اشاعت
۱	واہیات	رضا نقوی واہی	ادارۂ ساتھی، پٹنہ	۱۹۵۰ء
۲	طنز و تبسم	رضا نقوی واہی	مکتبۂ ادب، پٹنہ	۱۹۶۳ء
۳	نشتر و مرہم	رضا نقوی واہی	زندہ دلان حیدرآباد	۱۹۶۸ء
۴	کلام نرم و نازک	مناظر عاشق ہرگانوی	نسیم بک ڈپو، لکھنؤ	۱۹۷۰ء
۵	چٹ پٹی نظمیں	گوپال متل	مکتبۂ تحریک، دہلی	۱۹۷۲ء
۶	اردو شاعری اور بہار	رضا نقوی واہی	ہندی ساہتیہ سمیلن، پٹنہ	۱۹۷۱ء
۷	نام بہ نام	رضا نقوی واہی	پی کے پبلی کیشنز، دہلی	۱۹۷۴ء
۸	متاع واہی	رضا نقوی واہی	جے ٹی ایس پرنٹرز، پٹنہ	۱۹۸۳ء
۹	شعرستان واہی	رضا نقوی واہی	جے ٹی ایس پرنٹرز، پٹنہ	۱۹۸۳ء
۱۰	منظومات واہی	رضا نقوی واہی	جے ٹی ایس پرنٹرز، پٹنہ	۱۹۹۲ء
۱۱	باقیات واہی	شہناز فاطمی و جعفر رضا	گنگا جمنا پرکاشن، پٹنہ	۲۰۰۴ء
۱۲	رضا نقوی واہی: آئینہ در آئینہ	ڈاکٹر ہمایوں اشرف	کتابی دنیا، دہلی	۲۰۰۳ء
۱۳	طنز و مزاح: تاریخ و تنقید	ڈاکٹر طاہر تونسوی		۱۹۸۶ء
۱۴	اردو کی ظریفانہ شاعری اور اس کے نمائندے	فرمان فتح پوری	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی	۱۹۹۲ء
۱۵	مقالہ برائے پی ایچ ڈی	ڈاکٹر عقیل اشرف	رانچی یونیورسٹی، رانچی	غیر مطبوعہ

(ب) **رسائل**

نمبر شمار	نام رسالہ	مدیر	ناشر	سنہ اشاعت
۱	ادب نکھار (واہی نمبر)	بقا اعظمی	نکھار پبلی کیشن، مئو ناتھ بھنجن	۱۹۸۳ء
۲	ماہنامہ ''اردو دنیا''	خواجہ محمد اکرام الدین	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی	مئی ۲۰۱۵ء
۳	یادگاری مجلّہ ''جشن واہی''	ڈاکٹر ابوبکر رضوی	ٹی پی ایس کالج، پٹنہ	دسمبر ۲۰۱۷ء
۴	ماہنامہ ''آجکل''		پبلی کیشن ڈویژن، دہلی	اپریل ۱۹۷۴ء
۵	ماہنامہ ''کتاب نما''	شاہد علی خاں	مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی	ستمبر ۱۹۹۳ء